قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی. گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ ——— ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون : ۸۷۶۲۱۹

انتظامیہ

چیئرمین (بریگیڈیئر ریٹائرڈ) اعزاز الدین احمد خان

ناظم - محمد لطیف چوہدری

مجلسِ ادارت

مدیر مسئول - محمد لطیف چوہدری

معاون - ثریا عندلیب

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ناشر - عطاء الرحمٰن ارائیں

طابع - سید عبدالسلیم

مطبع - آفتاب عالم پریس

مقامِ اشاعت

۲۵ بی، گلبرگ ۲. لاہور

جلد ۴۷ ——— مارچ ۱۹۹۴ء ——— شمارہ ۳

بدل اشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک ——— ۱۸ امریکی ڈالر

فی پرچہ : -/۱۰ روپے

فہرست مضامین

اوراب ڈش کلچر (لمعات)	ادارہ	۲
اسوۂ رسولِ اعظم	علامہ غلام احمد پرویز	۶
محترمہ بینظیر بھٹو صاحبہ سے ایک سوال	محمد ارشاد	۱۵
صیام سے مفہوم و مقصود	اعزاز الدین احمد خان	۲۰
قرآن فہمی کے کلیدی اصول	بشیر احمد عابد	۲۵
قرآن اور علم الاعداد	حنیف وجدانی	۳۴
لیلۃ القدر	حسین امیر فرہاد	۳۸
دارد کوئی سوچ	صلاح الدین اکبر	۴۲
مغربی ثقافتی یلغار	وحید مراد۔ کراچی	۴۹
ذہنی انتشار اور فکری آوارگی	ثریا عندلیب	۵۴
وحدتِ انسانیت	عبداللہ ثانی	۶۱
حقائق و عبر	ادارہ	۷۶
بچوں کا صفحہ	علامہ غلام احمد پرویز	۷۸

لمعات

اَور اب ڈِش کلچر!

اس صدی کے دوسرے نصف ـــــ بلکہ جنگِ عظیم دوم کے بعد، سائنس نے جس تیزی سے ترقی کی ہے اس نے فاصلوں کی طنابیں کھینچ دی ہیں، کبھی شہروں کے فاصلے پاٹنے کے لئے بھی وقت درکار ہوتا تھا، اب ملکوں بلکہ براعظموں کو ذرائع رسل و رسائل کی برق رفتاری نے یکجا کر دیا ہے ـــــ اور نئے ذرائع ابلاغ، ٹی وی، سیٹلائٹ کے ذریعے نشریات اور ڈش اینٹینا نے اس کرۂ ارض کو ایک بین الاقوامی، بین البراعظمی گاؤں (GLOBAL VILLAGE) میں تبدیل کر دیا ہے۔

مگر یہ کارنامے جس تہذیب و تمدن کے علمبرداروں نے انجام دئے ہیں وہ میکانکی اور سیکولر تہذیب ہے جس کے لئے افراد، ان کے آئیڈیل، ان کی سوچ کوئی معنی نہیں رکھتے، اس کے پیشِ نظر انسانوں کی آزادی نہیں، دوسری تہذیبوں اور دوسرے ممالک پر غلبہ اور تمکن ہے۔ یہ اگر دوسروں کی تباہی سے ممکن ہو تو اسے اس میں کوئی عار نہ ہوگا۔

وقت کے تقاضوں کے مطابق اب غلبے کے لئے فوج کشی کی ضرورت کم از کم اس حد تک باقی نہیں جیسی یہ پچھلے وقتوں میں تھی ـــــ اب قوموں کی معیشت کو قابو کیا جاتا ہے، ان کی تہذیب کو نشانہ بنایا جاتا ہے، ان کی سوچ کو مفلوج کیا جاتا ہے، ان کے ضمیر کو متاثر کیا جاتا ہے۔ اسے برین واشنگ کہا جاتا ہے ـــــ ذرائع ابلاغ اس کا بڑا موثر ذریعہ ہیں۔

اقبالؒ نے کہا تھا،

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے موڑ

اس کے دور میں یہ ذرائع ابلاغ ہوتے جو آج ہیں تو وہ یقیناً تعلیم کی بجائے انہی کا ذکر کرتے۔

ان ذرائع ابلاغ کے بل پر آج جلد متاثر ہونے والے نوجوان اور ناپختہ ذہنوں پر حملے شدید تر ہوتے جا رہے ہیں ـــــ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے لباس، ان کی چال ڈھال، ان کی پسند ناپسند بدلتی جا رہی ہے ـــــ ان

کے ہیروبدل گئے ہیں۔

قدامت پرستوں نے اپنے اذہان، اپنی سوچ کے مطابق اس کا حل یہ تجویز کیا ہے کہ ڈش پر پابندی لگا دو، ناچ گانے پر پابندی عائد کر دو، اِس قسم کی یا اُس قسم کی فلموں اور ڈراموں کو بند کر دو، ڈراموں میں لباس یہ فلاں فلاں قسم کی پابندی ہو، پروگراموں کی میزبان لڑکیوں کو سر پہ دوپٹہ رکھنا لازمی قرار دیا جائے ـــــ یہ طریقے محدود انداز میں آزمائے بھی گئے، نیم دلانہ پابندیاں لگائی بھی گئیں ـــ جن پر رفتہ رفتہ گرفت ڈھیلی ہوتی گئی ـــــ اور پھر جب ایک ہی ملک میں ایک ہی شعبے کے دو اداروں پہ قانون کا نفاذ ایک طرح سے نہ ہو تو نتائج کیسے درست ہو سکتے ہیں ـــ ایک چینل میں طوعًا و کرہًا پابندی ہے تو دوسری میں دوپٹہ کٹ کے پہ بھی نہیں، سر سے غائب ہے، ایک طرف لباس اور میک اپ میں کسی حد تک سادگی ہے تو دوسری جانب نمائش کا عنصر غالب ـــــــ اور پھر ڈش کے اس دَور میں سنسر کی کارفرمائیاں ظاہر کو پوشیدہ کیسے رکھ سکتی ہیں، ڈش تک ہوتے ہوئے کوئی آئرن کرٹن، سلک کرٹن یا بمبو کرٹن لہروں کا راستہ نہیں روک سکتا، ان نشریات کو روکنا کسی کے بس میں نہیں۔

جہاں قدامت پرستوں نے جبر کے راستے کی نشاندہی کی، ماڈرن، اپنے آپ کو مہذب، روشن خیال کہنے اور سمجھنے والوں نے ایک اور طریقہ سمجھا یا ثقافتی حملے کے مقابلے کا ـــ مائیکل جیکسن کے مقابلے میں مقامی جیکسن تیار کر کے انہیں ٹی وی سکرین پر پیش کرنے کا انداز اپنایا جا رہا ہے' بلیے، بے ہنگم بال، کانوں میں بالیاں، گلے میں لاکٹ، پھٹی ہوئی پتلونیں، عجیب و غریب نقش نگار لیے ٹی شرٹیں، بے ڈھنگے میک اپ اور حلیے کے ساتھ اُچھل کود کرتے ہوئے نوجوان انمل بے جوڑ اکثر بے معنی اور کبھی کبھی لچر گیت گاتے ہوئے دکھائے جا رہے ہیں۔ ساتھ ہی ماڈل گرلز پہ اسی گیت پہ مبنی شاٹ دکھائے جا رہے ہیں اور بنے سجے تروتازہ جوان چہرے لڑکے اور لڑکیاں شاید بلا سوچے سمجھے صرف اس کی تان پہ جھومتے اور تالیاں پیٹتے ہوئے دکھائے جا رہے ہیں۔

نہ گانے والے سمجھ رہے ہیں کہ وہ کیا گا رہے ہیں اور نہ سننے والے اور سننے والیاں، اگر یہی باتیں جوان گانوں کے بول ہیں ان شریف زادیوں کو کوئی راہ چلتا نوجوان کہے تو یہ اسے غنڈہ بلکہ اپنی زبان میں گُنڈا کہیں گی ـــــــ [ہندوستانی فلموں کے زیرِ اثر اب خ، کھ میں اور غ، گ میں بدل چکی ہے]۔ اس شور، اس ہاؤ ہو کو نوجوانوں کی تفریح کہہ کر پیش کیا جا رہا ہے' آگے بڑھایا جا رہا ہے۔

ڈراموں میں گلیمر، شان و شوکت، دولت کی نمائش جس انداز سے دکھائی جا رہی ہے وہ پاکستان کے شاید صرف پانچ دس فیصد کی نمائندگی تو کر رہی ہو، باقی نوے فیصد کے ساتھ ایک بھیانک مذاق کے علاوہ کچھ نہیں ـــ یہ سب کچھ سپانسرز کے روپے کے بل پر ہو رہا ہے ورنہ اس ملک کے اور مسائل بھی ہیں جو توجہ طلب ہیں، لباس

کی تراش خراش، قالین، پردے، فرنیچر، کاروں کی نمائش ہمارا مطمحِ نظر بنتا جا رہا ہے ـــــ فلم، ٹی وی اور فیشن میگزینز کو تو آپ چھوڑیئے کسی عام مقبول قسم کے ہفت روزہ کو اٹھا کر دیکھ لیجئے، اُردو ہو یا انگریزی درمیان کے آٹھ دس صفحات نئے ماڈلوں پر سجائے گئے نئے ملبوسات پر مبنی ایک نمائش آپ کے سامنے ہوگی اور بارہا یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ یہ کپڑوں کی نمائش ہے، میک اپ کی یا جسم کی۔

شاید کسی کو ان باتوں پر غور کرنے کی فرصت نہیں، یہ سب کچھ چھاپنے، سپانسر کرنے، آگے بڑھانے والے اربابِ اقتدار کی نظروں میں خود کو بڑا معتبر، بڑا محبِ وطن اور ایک طرح سے قوم کے محسنوں کے روپ میں آگے لا رہے ہیں ـــــ کوئی نہیں سمجھتا کہ یہ بے رحم نظامِ سرمایہ داری کے حربے ہیں ـــــ

سید سبط حسن اپنی ایک کتاب میں رقمطراز ہیں،

"ریڈیو، ٹی وی، اخبارات اور ابلاغِ عامہ کے دوسرے ذریعوں سے مصنوعی احتیاجیں پیدا کی جاتی ہیں، لوگوں کے مزاج اور مذاق کو کنٹرول کرنے کی نت نئی ترکیبیں تلاش کی جاتی ہیں، نئے فیشن رائج ہوتے ہیں اور لوگوں کو چار و ناچار نئی وضعوں کی تقلید کرنا پڑتی ہے ـــــ

پہلے پتھروں کے بُت مندروں میں پوجے جاتے تھے، اب بازار کی ہر دکان بُت کدہ بن گئی ہے اور شوقین مزاجوں کے غول کے غول دن رات کبھی اس بت کو سجدہ کرتے ہیں کبھی اس بت کے آگے جُھک جاتے ہیں۔"

نظامِ سرمایہ داری میں جو اس وقت دنیا میں سکّہ رائج الوقت ہے، ہر شخص دوسرے کو اپنے فائدے کے استعمال کرنے کو جائز اور درست سمجھتا ہے، وہ ساتھ چلنے والوں کو روند کر آگے بڑھ جانے کو کامیابی گردانتا ہے، اس نظام نے انسان کو انسان سے بیگانہ بنا دیا ہے، یہ نظام تعاون کا نہیں، مسابقت کا علمبردار ہے،

ذرائع ابلاغ کا یہ کلچر اگر انجانے میں آگے لایا جا رہا ہے تو یہ بہت بڑی نادانی ہے اور اگر کسی سکیم کے تحت ایسا ہو رہا ہے تو ہمیں کہنے دیجئے کہ یہ عوام الناس، خاص طور پر نئی نسل سے خصوصی دشمنی کا مظہر ہے،

مگر نوجوانوں کی اس روش کو بے راہ روی یا مغرب زدگی کہہ کر بری الذمہ ہو جانا بھی کوئی بات نہیں، اس کی وجوہ پہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں ان کا بھی کوئی قصور نہیں، ڈش نے جو تفریح کا پکوان انہیں پیش کیا ہے اسے وہ بے چون وچرا نیا ذائقہ سمجھ کر اس لئے قبول کر رہے ہیں کہ ان کے کام و دہن اپنے پکوان کی لذت سے ناآشنا ہیں یا بیزار ہیں، ـــــ مغرب چونکہ مادی طور پر اپنی برتری کا سکّہ پہلے ہی منوا چکا ہے اس لئے اس کی یہ کلچرل ڈش بھی اسے قبول ہے اور مغرب کے دستور تو ہمیشہ سے نرالے ہیں۔

میخانۂ مغرب کے دستور نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اوّل دیتے ہیں شراب آخر

ہم نے آزادی کے ان چھیالیس سالوں میں انہیں کونسی مثبت اقدار فراہم کی ہیں کہ وہ مضبوط زمین پر مضبوط پاؤں جما کر کھڑے ہو سکتے، ہم نے نہ انہیں درست تعلیم دی، نہ تربیت۔

تعلیم ہے تو وہی لارڈ میکالے، فورٹ ولیم کالج والی جو صرف کلرک پیدا کرتی ہے۔ آزاد اقوام آزاد معاشروں کو تو اپنی قوم کے لئے نئی منزلوں کی طرف راہنمائی کرنے والے اذہان تیار کرنے ہوتے ہیں۔ سائنسدان اپنا کام لگن سے مناسب ماحول ہی میں کر سکتے ہیں اور یہ ماحول مہیا کرنا انہیں صاحبانِ فہم و دانش کا کام ہوتا ہے جو قوم کے مستقبل کا تعین کرتے ہیں، ایسے میں سائنسدان ہی نہیں قوم کا ہر شخص ایک ہی منزل کی طرف رُخ کئے مصروفِ سفر ہوتا ہے۔

اور پھر محض سائنسی ترقی انسانی ارتقاء میں حرفِ آخر نہیں، اس کی حیثیت زندگی کے صرف ایک پہلو کی ہے، اگر یہی انسانی ترقی کی معراج ہوتی تو مغرب کا معاشرہ جنت نظیر ہوتا، وہاں سے اونچ نیچ، دکھ درد، بے چینی، بے اطمینانی قصۂ ماضی بن چکا ہوتا۔

زندگی میں اصل چیز وہ انسانی اقدار ہیں جن پر کوئی معاشرہ تعمیر کیا جاتا ہے، دوسری ہر چیز اس کے تابع ہونی چاہیئے ـــــ اور یہ اقدار ایسی ہونی چاہئیں جو مستقل بالذات ہوں، غیر متبدل ہوں، وقت کے ساتھ ساتھ ان میں کوئی فرق نہ آئے۔

مغربی معاشرہ NOTHING IS GOOD OR BAD ; ONLY THINKING MAKES IT SO کے مقولے پر مبنی ہے مگر جن اقدار کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ محکم ہیں اور ان کی پاسداری ہر حال میں ہمارا ایمان ہے ـــــ یہ اقدار ہمیں قرآنِ پاک سے مل سکتی ہیں، علیم و حکیم خدا جو اقدار ہمیں دیتا ہے وہ اس قسم کی باتوں سے بلند ہیں۔

ہم نے اگر ان اقدار کو زندگی میں جاری و ساری کیا ہوتا، ان کے سامنے زندہ مثالیں ہوتیں تو نوجوانوں کو ان اقدار کے لئے سرگرداں نہ ہونا پڑتا، ان کے قدم کسی حملے کے نتیجے میں کبھی نہ ڈگمگاتے، ہم نے تو ان کے سامنے رشوت، سفارش، دھونس، دھاندلی، غنڈہ گردی، غارت گری، غیر قانونی، غیر اخلاقی حربوں سے اٹے ہوئے معاشرے کی مثال رکھی، ایسے میں اگر ہم ان سے سچ، استقامت اور قربانی جیسی بلند اقدار کی باتیں کریں گے بھی تو وہ اسے ہمارا دوغلا پن، ہماری دورُخی سمجھ کر ہمارے منافقانہ رویوں کی نشاندہی کریں گے اور ان میں اتنی جرأت ہے کہ وہ اسے ہمارے مُنہ پر دے ماریں گے۔

اس کے باوجود ہم نئی نسل کی سعید روحوں کو دعوت دیتے ہیں کہ دنیا کو ایک بہتر مستقبل دینے کے لئے از خود آگے بڑھیں، ایک طرف اپنے بزرگوں کو اُن کی ذمہ داریوں سے آگاہ کریں اور دوسری طرف ان کے تجربوں سے رہنمائی حاصل کریں اور یوں اقبالؒ کے اس فرمان کی تفسیر بن جائیں۔

جوانوں کو پیروں کا استاد کر

قارئین طلوعِ اسلام

کو

ادارۂ طلوعِ اسلام کی طرف

سے

دِلی عید مبارک

علامہ غلام احمد پرویزؒ

اُسوۂ رسولِ اعظمؐ

قُم فَاَنْذِرْ

خیز و بخاکِ تشنہ بادۂ زندگی فشاں!

سچا رسول وہ ہے جس کے پاس (نوعِ انسانی کے لئے) کوئی پیغام ہو. وہ جس کی روح میں اُس زمانہ کے اہم مسائلِ حیات، اضطرابی کیفیت پیدا کر دیں اور ان مسائل و مباحث کی اہمیت اسے دعوت اور پکار پر مجبور کر دے۔

(MOHAMMAD - THE MAN AND HIS FAITH

BY TOR ANDRE.)

اسی حقیقت کو علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"محمدؐ عربی فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے. خدا شاہد ہے کہ اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا" یہ الفاظ ایک بہت بڑے مسلمان صوفی بزرگ (حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ) کے ہیں. تصوف کے لٹریچر میں ان جیسے اور الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ہے جو ایک فقرہ کے اندر شعورِ نبوت اور تصوف[1] کے اس قدر لطیف نفسیاتی

---

[1] ہم اس وقت اس بحث میں نہیں جانا چاہتے کہ تصوف کی ماہیت کیا ہے۔ اس وقت صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ ایک صوفی کا تجربہ (جو کچھ بھی وہ ہے) اس کی اپنی ذات تک محدود ہوتا ہے اور جب کوئی دوسرا اس سے اس کے متعلق پوچھتا ہے تو وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا کہ — ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی — لیکن وحی کا مقصد ایک جہانِ نو کی تخلیق ہوتا ہے۔ (تصوف کی ماہیت کے متعلق میری کتاب — سلیم کے نام خطوط — دیکھئے۔

فرق کو اس طرح واضح کر دیں۔ ایک صوفی اپنے انفرادی تجربہ کی تجرّد گاہ سے واپس آنا نہیں چاہتا اور جب واپس آتا بھی ہے (اس لئے کہ اسے واپس آنا پڑتا ہے) تو اس کی یہ مراجعت نوعِ انسانی کے لئے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس، ایک نبی کی مراجعت تخلیقی ہوتی ہے۔ وہ آتا ہے کہ زمانہ کے طوفان پر تسلط پا کر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے اور اس طرح مقاصد و مطامح کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے۔ ایک صوفی کے لئے اس کے انفرادی تجربہ کی تجرّد گاہ، آخری مقام ہوتی ہے۔ لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے زلزلہ انگیز نفسی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کر دیں۔ یہ آرزو کہ جو کچھ اس کی آنکھ نے دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے، نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اسی لئے ایک صاحبِ وحی کے "تجربہ" کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیسا ہے اور اس کے پیغام کی روح سے جس قسم کی دنیائے ثقافت ابھر کر سامنے آگئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔ (خطبات ص۱۱۸)

عظیم الشان فریضہ وحی ملنے کے بعد آپؐ پر انسانی دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کا عظیم فریضہ عائد ہو گیا۔ چنانچہ ندائے خداوندی نے آپؐ کو پکارا اور کہا کہ

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ (۷۴/۳-۱)

اے وہ کہ جس کے ذمے دنیا کو سنوارنے اور جہانِ نو پیدا کرنے کا فریضہ عائد کیا گیا ہے۔ اٹھ اور نوعِ انسانی کو، غلط راستے پر چلنے کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر دے اور اس حقیقت کا اعلان کر دے کہ کبریائی صرف خدا کے لئے ہے۔

قُمْ (اُٹھ) کہ تیرے قیام میں نوعِ انسانی کا قیام مضمر ہے اور قیامِ انسانیت ہی تخلیقِ کائنات کا مقصود ہے۔ انسانوں کی پوری بستی پر موت کی سی افسردگی طاری ہو چکی ہے۔ دنیا میں زندگی کی کوئی رمق کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ اُٹھ! اور خونِ رگِ کائنات میں تموج پیدا کر دے۔

خیز د بخاکِ تشنہ بادۂ زندگی فشاں!

انقلاب! نظامِ عالم درہم برہم ہو چکا ہے۔ نوعِ انساں، وحدتِ خلق کا بنیادی اصول بھلا کر، رنگ، نسل، وطن، زبان کی غیر فطری حدود و ثغور سے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی ہے جس سے یہ دنیا، انسانوں کی بستی کے بجائے خونخوار درندوں کا بھٹ بن چکی ہے۔ اُٹھ! اور انسانیت کا فراموش کردہ آئین پھر ان

کی نگاہوں کے سامنے لا۔

خیزد قانونِ اخوت سازدہ
جامِ صہبائے محبت بازدہ

قبائل و شعوب اور اقوام و ملل ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہو رہی ہیں۔ یہ خاکدانِ ارضی جسے امن و سلامتی کی جنت بننا تھا، انسانی سبعیت و بربریت کے ہاتھوں ہلاکت و بربادی کا شعلہ بار جہنم بن رہا ہے۔ اٹھ! اور اس جہنم کی انسانیت سوز آتش فشانیوں کو، اپنے عالمگیر سحابِ اخوت و مودت کے ترشح سے بردو سلامتی کی جنت بنادے۔

باز در عالم بیار ایامِ صلح
جنگجویاں را بدہ پیغامِ صلح

ملوکیت اور سرمایہ پرستی کی ملعونہ مفاد پرستیوں نے انسانوں کی گردنوں میں اپنی چیرہ دستیوں کے اطواق و سلاسل پہنا رکھے ہیں۔ احبار و رہبان کی انسان فروش برہمنیت نے خدا اور بندے کے درمیان آسمان بوس دیواریں حائل کر رکھی ہیں۔ ذرّے کو خورشید سے کوئی نسبت نہیں رہی۔ عابد اور معبود میں کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ سنگِ آستانِ حرم، سجودِ اہلِ دنیا سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ قلوب کے رشتے منقطع ہو گئے ہیں۔ تسبیح کا دھاگہ ٹوٹ چکا ہے۔ اُٹھ! اور دنیا میں ان تمام طاغوتی قوتوں کو پامال کر کے انسان اور انسان اور خدا اور بندے میں حقیقی تعلق پیدا کردے۔

باز ایں اوراق را شیرازہ کن
باز آئینِ محبت تازہ کن

اُٹھ! اور اس انقلاب آفریں دعوتِ حق و صداقت سے کوہ و جبل اور دشت و صحرا کی فضا میں حیات انگیز تحرک پیدا کردے جس سے تمام نظامہائے کہن کی بنیادیں ہل جائیں اور ان کی جگہ دنیا میں وہ نظامِ عدل و حریت قائم ہو جائے جس سے انسانیت کو اس فضائے بسیط میں اذنِ بال کشائی ملے اور وہ ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی اپنے معراجِ کبریٰ تک جا پہنچے جہاں نمائندگانِ عالمِ ملکوت، جنت سے نکلے ہوئے آدم کا استقبال اس پیغامِ تبریک و تہنیت سے کریں کہ

وَ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۴۳/۷۲)۔

یہ وہ جنت ہے جس کا تمہیں، تمہارے اعمال کے بدلے میں، وارث قرار دیا گیا ہے۔

●

یہ تھا وہ انقلاب آفریں پیغام جسے دنیا میں عام کرنے کا فریضہ آپؐ پر عائد کیا گیا۔ وہ پیغام حریت آموز جس کی خصوصیت یہ ہے کہ

زندگی را می کند تفسیرِ نو — می دہد ایں خواب را تعبیرِ نو
بندہا از پا کشاید بندہ را — از خداوندی رہاید بندہ را
پختہ سازد فطرتِ ہر خام را — از حرم بیروں کند اصنام را

كَذٰلِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (۲/۷۳)

اللہ اس طرح مردوں کو زندگی بخشتا اور تمہیں اپنی (قدرت وحکمت کی) نشانیاں دکھلاتا ہے تاکہ تم فہم ودانش سے کام لو!

پہلی دعوتِ حیات بخش

ذمہ داریوں کی اس دنیا کو اپنے کندھوں پر اٹھائے حضورؐ نے اپنی قوم کو مخاطب کیا اور صفا کی پہاڑی پر چڑھ کر پکارا یَا صَبَاحَاهُ! عرب میں یہ لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب صبح کے وقت کوئی قبیلہ دوسرے قبیلہ پر دفعتہً قتل وغارتگری کے لئے ٹوٹ پڑے۔ یہ لفظ سُنکر تمام لوگ چونک اٹھے اور آپ کے گرد جمع ہو گئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ

يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ!

اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے دامن سے ایک فوج نکلا چاہتی ہے تو تم کیا میری اس بات کو سچ مانو گے[1]؟

انہوں نے بیک زبان کہا کہ ہم نے آج تک کبھی کوئی غلط بات تمہاری زبان سے نہیں سُنی۔ ہم یقین کرتے ہیں کہ تو صادق اور امین ہے، اس لئے تمہاری بات کو ضرور سچ مانیں گے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا۔ میں تمہیں آگاہ کرتا ہوں کہ تمہاری موجودہ روشِ زندگی سے تم پر ایک سخت تباہی آنے والی ہے جسے یوں سمجھو کہ تمہارے سر پر کھڑی ہے۔ اس پر ابولہب نے نہایت استخفاف سے کہا کہ کیا ہم سب کو اسی لئے جمع کیا تھا؟ یہ کہہ کر وہ چلا آیا اور اس کے ساتھ دوسرے لوگ بھی چلے گئے۔ یہ قریش کی طرف ایک عمومی دعوت تھی۔

ذرا اس دعوت کے انداز پر غور فرمائیے اور دیکھئے کہ نبی اکرمؐ نے مقامِ نبوت کی وضاحت کیسے دلنشین انداز سے فرمائی ہے۔ نبی کے معنی ہیں مقام بلند پر کھڑا ہونے والا۔ آپؐ صفا کی چوٹی پر کھڑے ہیں جہاں

---

[1] بخاری جلد دوم

مقامِ نبوّت کی وضاحت

سے آپؐ پہاڑ کے دونوں جانب دیکھ سکتے ہیں۔ مخاطبین پہاڑ کے دامن میں ہیں جہاں وہ صرف پہاڑ کے ایک طرف دیکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا جو شخص ایسے مقام پر کھڑا ہو جہاں سے پہاڑ کی دوسری سمت بھی نظر آ رہی ہو وہ دوسری طرف کے ماجریات و واقعات کو آنکھوں دیکھ کر بتا سکتا ہے۔ اور اگر مخاطبین کو اس کی صداقت پر ایمان ہے، تو اس کی کسی بات میں شبہ نہیں ہو سکتا۔ نبی بھی خدا کی طرف سے ایک ایسے بلند مقام پر فائز ہوتا ہے جہاں وہ وحیٔ خداوندی کی روشنی میں انسانی اعمال کے حال (PRESENT) کے ساتھ ساتھ ان کا مستقبل (FUTURE) بھی دیکھ سکتا ہے[1]۔ یہ تھی اس دعوتِ انقلاب کی ابتداء۔ یہ تھی وہ آسمانی آواز جسے سننے کے لئے فضائے عالم ایک مدّت سے گوش برآواز تھی۔

دعوت کا جواب!

لوگوں نے اس دعوت کو سُنا اور استخفاف کی ہنسی سے اس کا استقبال کر کے واپس چلے گئے۔ لیکن کیا اس سے یہ داعیٔ انقلاب اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو گیا؟ کیا اس نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیا کہ میرے ذمہ جو فریضہ تھا وہ ادا ہو گیا اب اس سے زیادہ میں کیا کر سکتا ہوں؟ ایسا کس طرح سے ہو سکتا تھا؟ آپؐ کے ذمہ تو اس پیغام کو عملی طور پر متشکل کرنا تھا اور اس کی تشکیل و تعمیر ناممکن تھی جب تک تمام سرکش قوتوں کو مغلوب نہ کر لیا جائے۔ اس لئے اس داعیٔ انقلاب (علیہ التحیۃ و السلام) کے فریضۂ زندگی کو یہیں ختم نہیں ہو جانا تھا۔ یہ تو اس کی ابتدا رکھی۔

پہلی دعوت عمومی تھی۔ اس کے بعد یہ سلسلۂ دعوت و تبلیغ ایک نظام کی شکل میں آگے بڑھنا شروع ہوا۔ اس کی ابتدا آپؐ نے خود اپنے اہلِ خاندان سے کی۔ چنانچہ جب آپؐ کو حکم ملا کہ

وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (۲۶/۲۱۴)

اور (اے پیغمبر!) اپنے قریبی رشتہ داروں کو (غلط روش زندگی کے نتائج سے) آگاہ کرو!

اہلِ خاندان کو دعوت

تو آپؐ نے تمام بنو ہاشم کو کھانے پر بلایا اور ان سے کہا کہ "میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جو دین اور دنیا دونوں کی کفیل ہے۔ اس بارِ گراں اٹھانے میں کون میرا ساتھ دے گا؟" خاندان کے بڑے سُن رہے تھے اور محوِ حیرت تھے کہ ہماری گود کا کھلایا ہوا بچہ

---

[1] مقامِ نبوّت کی وضاحت کے لئے دیکھئے "مقامِ محمدیؐ" جو سلیم کے نام خطوط میں شامل ہے۔

ہمیں کیا باتیں سُنا رہا ہے؟ جب آپؐ نے اپنے چچا ابوطالب سے کہا کہ "اپنے تیرہ سالہ بیٹے (حضرت) علیؓ کی بات مانا کرو اور جو کچھ وہ کہا کرے اسے بغور سنا کرو۔" تو تمام مجمع کھلکھلا کر ہنسا اور ابوطالب سے تمسخر کرنے لگا کہ لو! آج سے بیٹے کا حکم مانا کرو۔

انہیں کیا علم کہ جس بات کو ماننے کے لئے کہا گیا تھا اس میں بیٹے اور باپ کے رشتہ کا کوئی تعلق نہیں تھا! وہ تو کلمۂ حق وصداقت کے سامنے جھک جانے کا مطالبہ تھا۔ یہ کلمۂ صداقت بیٹے کی زبان سے نکلے تو باپ کے سامنے جھک جائے اور باپ کی زبان سے نکلے تو بیٹا جھک جائے۔

لیکن ابھی یہ بات ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی جنہوں نے سُن رکھا تھا کہ باپ کی اطاعت بیٹے پر بہرحال لازم ہے۔

سورۂ قصص میں ہے کہ رسول کو ملک کے دارالخلافہ میں مبعوث کیا جاتا ہے (۲۸/۵۹)۔ اس لئے کہ وہ تمام آبادی کا مرکز اور ان کے افکار و اعمال کا منبع ہوتا ہے۔

اہلِ مکّہ کو دعوت

حضورؐ کی بعثتِ مقدسہ مکّہ میں ہوئی جو نہ صرف حجاز کی اجتماعی زندگی کا مرکز تھا، بلکہ تمام عرب کی عقیدتمندیوں کا قبلہ تھا اور اپنی اوّلیت اور اہمیت کی بنا پر اُمّ القریٰ (بستیوں کی ماں) کہلاتا تھا۔ اب اس صدائے حق وصداقت کو اپنے خاندان سے آگے بڑھ کر اُم القریٰ اور اس کے گردوپیش تک پہنچانے کا حکم ہوا۔

وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ (۶/۹۲ نیز ۴۲/۷)

اور (دیکھو) یہ کتاب (قرآن) ہے جسے ہم نے (توریت کی طرح) نازل کیا۔ یہ بڑی بابرکت ہے اور جو تعلیم اس سے پہلے انبیاء کرام کو دی گئی تھی اسے سچا کر دکھانے والی ہے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ تم اس کے ذریعے (شہر مکّہ) کے باشندوں کو اور ان لوگوں کو جو اس کے گردونواح بستے ہیں ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرو۔

اُس وقت اس انقلابی جماعت، اس حزب اللہ کی تعداد قریب چالیسؔ تک پہنچ چکی تھی۔ آج اس دور میں جبکہ جماعتوں کی کثرت وقلت کا معیار صرف سروں کی گنتی رہ گیا ہے، چالیس نفوس پر مشتمل جماعت کو شاید جماعت کے نام سے موسوم بھی نہ کیا جائے۔ لیکن ہمیں کیا معلوم ان چالیسؔ مقدس پیکروں کے سینے میں جو قلوب متحرک تھے ان کی دھڑکنوں میں کتنی قیامتیں چھپی ہوئی تھیں۔ آج جماعت کی قوت کے پیمانے

ہاتھوں کا شمار ہیں۔ اُس وقت قوتوں کا مقیاس ایمان کی حرارت تھی اور ایمان کی قوت ایسی کوہ شکن اور خارا شگاف ہوتی ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی قوت بھی اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

سب سے پہلی شہادت

آپؐ نے اب خاص حرمِ کعبہ میں پہنچ کر توحید کا اعلان کر دیا۔ مخالفین کے نزدیک یہ حرم کی سب سے بڑی بے حرمتی تھی۔ یہ ان کی حمیت و غیرت کے خلاف سب سے بڑا اعلانِ جنگ تھا۔ چاروں طرف سے لوگ اس جماعت پر ٹوٹ پڑے۔ حضورؐ کے رسیب، حارث ابن ابی ہالہ یہ خبر سُنکر اپنے گھر سے دوڑے دوڑے آئے کہ آپ کو بچالیں لیکن وہ مخالفین کے ہجوم میں گھر گئے اور شہید ہو گئے۔ اعلائے کلمۃ الحق کے سلسلہ میں یہ خون کے پہلے قطرے تھے جن سے یہ زمین رشکِ صد آسماں بن گئی۔ ایسے مقدس خون کے لئے حرم کی سرزمین سے زیادہ اور کونسا مقام موزوں ہو سکتا تھا۔ شجرِ اسلام کو اسی خون کے قطرات کی آبیاری کی ضرورت تھی۔ ملت کی سرخروئی اسی خون کی رنگینی کی دستِ نگر تھی۔ دنیا میں کونسا انقلاب ہے جس کی کامیابی کی داستانیں خونیں حروف سے نہیں لکھی گئیں؟ کونسی تحریک ہے جو شمشیر و سناں کے سایوں میں پروان نہیں چڑھی؟ حق و باطل کی کونسی آویزش ہے جس کے فیصلے قتل گاہوں میں نہیں ہوئے؟ صدق و عدل کی کونسی آواز ہے جسے دبانے کے لئے ابلیسی نظامِ استبداد نے دار و رسن سے گریز کیا ہے؟ ازل سے یہی ہوتا آیا ہے اور ابد تک یہی ہوتا رہے گا۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

اہلِ عرب کی طرف

اہلِ مکہ کے بعد اس دعوت کو تمام قوم تک پہنچایا گیا۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ (۱۳/۳۰)

اور (اے پیغمبر!) اسی طرح ہم نے تجھے ایک ایسی قوم کی طرف بھیجا جس سے پہلے بہت سی قومیں گذر چکی ہیں اور اس لئے بھیجا ہے کہ جو تعلیم تمہیں بذریعہ وحی دی گئی ہے اسے ان کے سامنے پیش کر دے۔

تمام نوعِ انسانی کی طرف

اس سے پہلے وحی کی تعلیم خاص قبیلوں اور خاص قوموں تک محدود رہتی تھی لیکن جو تعلیم خدا کے اس آخری رسولؐ کے ذریعے دی گئی تھی اس کی مخاطب تمام نوعِ انسان تھی۔ یعنی یہ تعلیم زمان کی حدود سے ناآشنا اور مکان کی قیود سے بے نیاز تھی۔ اسے عالمگیر انسانیت کا ضابطۂ زندگی بننا تھا اور قیامت تک آنے والے انسانوں کی راہ نمائی کا فریضہ ادا کرنا تھا۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے سلسلہ میں فرمایا کہ

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ (۷/۱۵۸)

اے پیغمبر! تم عالمگیر انسانیت کو مخاطب کر کے کہہ دو کہ میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔ اس خدا کا بھیجا ہوا رسول جس کا اقتدار تمام کائنات میں کارفرما ہے۔

اور چونکہ انسان بھی کائنات ہی کے ایک گوشے کا مکین ہے، اس لئے اس کی دنیا میں بھی اقتدار و اختیار خدا ہی کا ہونا چاہیئے۔

یہ تھی وہ انقلاب انگیز دعوت جس کا مرکز مکہ بنا اور جس کا محیط تمام کرۂ ارض کو بننا تھا۔

درسِ قرآن

ہر ماہ کی دوسری اور آخری جمعرات۔

بعد از نمازِ عصر

بمقام: ۲۱ ایف آفسرز کالونی لالہ رُخ

واہ چھاؤنی

رابطہ: جناب سید آفتاب حسین

محمد ارشاد

محترمہ بینظیر بھٹو صاحبہ سے ایک اہم سوال

محترمہ! السلام علیکم۔

"شریعت بل کی حقیقت" کے عنوان سے آپ کا ایک مضمون ۱۹ مئی ۱۹۹۱ء کو روزنامہ جنگ میں شائع ہوا تھا جس میں آپ نے وضاحت سے فرمایا تھا۔

"اگرچہ شریعت بل موجودہ حکمران سیاسی اتحاد نے اسمبلی میں موجود اکثریت کی وجہ سے منظور کر لیا ہے لیکن حقائق اپنی جگہ موجود رہتے ہیں اور آنے والا وقت بتائے گا کہ اس ضمن میں کس کا موقف درست تھا اور کس کا غلط تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ شریعت بل آئینی طور پر اسمبلی میں پیش ہی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ فیڈرل لیجسلیٹو لسٹ کے تحت نہ تو یہ قومی اسمبلی کے قانونی دائرہ کار میں ہے اور نہ ہی آئین میں پیشگی ترمیم کے بغیر ایسا بل پیش کرنا ممکن ہے۔ اگر آئین میں ترمیم کی جاتی ہے تو ایسا عمل صوبائی خود مختاری کے تصور کی خلاف ورزی کے مترادف ہوگا۔

آئین کے آرٹیکل ۷۰، کے تحت آئین شیڈول نمبر ۴ میں دی گئی فیڈرل لیجسلیٹو لسٹ میں دیئے گئے موضوعات پر کوئی بل ایوان میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ دو لسٹوں میں شامل ۱۴۲ آئیٹموں میں سے شریعت کی بابت موضوعات یہ ہیں۔ اسلامی تعلیم، زکوٰۃ، انصاف (یعنی فیڈرل لیجسلیٹو لسٹ کے آئیٹم نمبر ۳۹، ۴۰، ۴۳، اے)۔

ان موضوعات پر قانون سازی پہلے ہی ہو چکی ہے اور اگر ان میں بعض ترامیم کی ضرورت ہے تو پارلیمنٹ کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے ضروری قانون سازی کی جا سکتی ہے۔ شریعت بل کا نفاذ پارلیمنٹ کے دائرۂ اختیار سے ہی باہر ہے اور یہ معاملہ صوبائی قانون ساز اداروں کے دائرۂ کار میں آتا ہے۔ آئین کے آرٹیکل ۲۲۷ کے تحت آئین نے پہلے ہی پارلیمنٹ پر قانون سازی کے سلسلے میں کچھ پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔

ا۔ تمام موجودہ قوانین کو قرآن و سنت میں دی گئی اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالا جائے گا۔

ب۔ کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جائے گا جو اسلامی تعلیمات کے منافی ہو۔

اس بنیادی گارنٹی کے بعد اب کوئی قانون ساز ادارہ اسلام کی تعلیمات کے برعکس قانون سازی کر

ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ موجودہ شریعت بل بے معنی ہے اور محض ایک ایسے موضوع پر سیاسی فائدہ اٹھانے کی ایسی کوشش ہے جس سے بحث و تکرار کے دروازے کھل گئے ہیں اور فرقہ واریت کو ہوا ملی ہے۔

ج۔ ۱۹۷۳ء کے اصل آئین کے آرٹیکل ۲ کے تحت اسلام کو مملکت کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا ہے (اور یہ قرآن پاک کی اس آیت کے مطابق کہ اللہ نے تمہارے لئے دینِ اسلام کو منتخب کیا ہے)۔

اس سچائی کا یہ تسلسل ہے کہ آرٹیکل ۲۲۷ میں آئین نے صرف قرآن اور سنت کا حوالہ دیا ہے اور ایک دو یا زیادہ فرقوں کو تسلیم کرنے کی بات نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبرِ اسلام کسی خاص فرقے یا کسی خاص فقہ سے تعلق نہ رکھتے تھے اور نہ ہی قرآن شریف کسی خاص فرقے یا فقہ کے لئے مخصوص ہے اس کے برعکس قرآن شریف صرف اور صرف اسلام کی بات کرتا ہے یہی سبب ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل کے وقت آئین میں "فرقے" کا لفظ استعمال نہیں کیا اور اس کے برعکس یہ شرط رکھی کہ مختلف مکاتبِ فکر سے متعلقہ افراد اس اسلامی نظریاتی کونسل کے ارکان ہوں گے۔

۱۹۸۰ء کا صدارتی آرڈیننس نمبر ۱۴ مارشل لاء دور میں لاگو کیا گیا تھا جس میں آئین کے آرٹیکل نمبر ۲۲۷ کے ساتھ اس وضاحت کا اضافہ کیا گیا کہ قرآن اور سنت کے حوالے سے ہر فرقے کی تشریحات اپنی اپنی ہونگی فرقہ کو آئینی تحفظ مارشل لاء کے دور میں ملا۔ یہ کام قرآن شریف کی بنیادی روح (جس کا اصل آئین میں خیال رکھا گیا تھا) کے خلاف کیا گیا ہے۔ قرآن پاک "ایک امت" کی بات کرتا ہے اور اس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ فرقہ بازی خدا کو پسند نہیں ہے۔ ہم اپنے قانون اور آئین میں وہ بات کیسے قبول کر سکتے ہیں جس کی قرآن شریف میں واضح طور پر ممانعت کی گئی ہے۔ پھر طرفہ تماشا یہ ہے کہ شریعت بل میں کتنے فرقے تسلیم کئے گئے ہیں اور یہ کہ لسٹ کہاں ہے؟

قرآن پاک آنے والے سب زمانوں کے لئے ہے اور یہ قانون سازی کا سرچشمہ ہے، رہنمائی کا ذریعہ ہے اور بجائے خود قانون نہیں ہے۔ قرآن شریف کا کہنا ہے کہ اس کی سچائیوں کے منکشف ہونے کا سلسلہ وقت کے ساتھ ساتھ جاری رہے گا لیکن شریعت بل میں اس کی تشریح اور تعبیر کے سلسلے میں حدود متعین کر دی گئی ہیں اس طرح لافانی دانش کے ایک مسلسل عمل کو معینہ پیش لفظ کا پابند کرنے کی کوشش کی گئی ہے (چیپٹر ۳۸۔ آخری دو پیراگراف)۔

قرآن پاک میں بار بار کہا گیا ہے کہ اس کی آیات مختلف سورتوں میں ایک ہی سچائی کو مختلف انداز میں واضح کرتی ہیں۔ (چیپٹر ۶۔ ورسز ۶۵/۱۰۶) لیکن شریعت بل کا مقصد یہ ہے کہ قرآن پاک کی ایک سچائی کو مختلف فرقوں کی الگ الگ تشریحات کے تحت لاکر نعوذ باللہ مسخ کر دیا جائے اس طرح قرآن پاک کی

تفہیم کی حد بندی بھی شریعت بل کے سیکشن نمبر ۴ میں کردی گئی ہے۔

۶۔ قراردادِ مقاصد کی دفعہ ۵ میں کہا گیا ہے کہ "مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ اپنی زندگیاں انفرادی اور اجتماعی طور پر قرآن و سنّت کی روشنی میں اسلام کی تعلیمات اور تقاضوں کے مطابق ڈھالیں" لیکن شریعت بل کے پیش لفظ میں مذکورہ شق میں ترمیم کئے بغیر یہ الفاظ شامل کر کے اسے کالعدم قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام کو مملکت کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ تمام مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ قرآن و سنّت کی تعلیمات پر عملدرآمد کریں اور اپنی زندگیوں کو اللہ کے قانون کی مکمل تابعداری کے عمل کے تحت ڈھال لیں۔

یہ بات انتہائی اہم ہے کہ اس طرح شریعت بل میں قرآن و سنّت پر عمل درآمد کا سارا بوجھ شہریوں پر ڈال دیا گیا ہے جبکہ آئین اور بانیانِ پاکستان کی منظور کردہ قرارداد مقاصد میں قرآن و سنت پر عمل درآمد کے سلسلے میں بنیادی ذمّہ داری (قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق) مملکت پر ڈالی گئی تھی کہ وہ ایسے اقدامات کرے کہ عوام اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو قرآن و سنت کے مطابق ڈھال لیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مملکت کی ذمّہ داریاں کیا ہیں؟ اور مملکت کس طرح افراد کو اپنی زندگیاں اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے پر مائل کر سکے گی۔

(۱) بل میں لوگوں کے تعلیم کے حق کی بات (پرائمری کی سطح تک ہی سہی) نہیں کی گئی جبکہ رسولِ اکرمؐ نے واضح طور پر فرمایا ہے کہ تعلیم کا حصول ہر ایک پر فرض ہے۔ شہریوں سے اپنی زندگی اسلام کی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کی توقع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان کا تعلیم حاصل کرنے کا حق ان کو دیا جائے۔

(۲) قرآن شریف میں آتا ہے کہ ضروریاتِ زندگی اور مساوی سطح پر تحفظ فراہم کرنا مملکت کی بنیادی ذمّہ داری ہے (چیپٹر ۶، ورسز ۱۵۲) لیکن اس بنیادی حکومتی ذمّہ داری کے سلسلے میں بل خاموش ہے۔ جب لوگ غربت کی آخری حد پر کھڑے ہوں تو ہم ان سے اسلامی تعلیمات پر عمل درآمد کی توقع کیسے کر سکتے ہیں۔ کیا پیغمبرِ اسلامؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ غربت لوگوں کو کفر کی طرف دھکیل دیتی ہے۔

(۳) مذہب کی آزادی قرآن شریف کا بنیادی تصور ہے اور قرآن شریف نے مذہبی مقامات اور مراکز کی حفاظت کو ضروری قرار دیا ہے۔

(س) شریعت بل میں قرآن شریف کو "قانون" قرار دیا گیا ہے اور بل پیش کرنے والوں نے اس سے فائدہ (سیاسی) اٹھانے کے لئے "سپریم لاء" کا نام دیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ "قانون" انسان کا بنایا ہوا ہوتا ہے۔ تمام قوانین احاطۂ کار کے لحاظ سے محدود ہوتے ہیں۔ قوانین میں ترامیم ہوتی رہتی ہیں۔

ایک کی جگہ دوسرا قانون لایا جا سکتا ہے اور قوانین کالعدم بھی قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ لفظ "قانون" عربی کا لفظ ہے لیکن خدا نے قرآن شریف یا سنت کے لئے لفظ قانون استعمال نہیں فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ پاک میں قرآن کا ذکر ۶۹ جگہ فرمایا ہے لیکن کسی جگہ قرآنِ پاک کے لئے "سپریم لاء" کی اصطلاح استعمال نہیں فرمائی۔ آخر اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور تھی اور آج ہم اس کی وجہ اور سبب کا مشاہدہ خود کر رہے ہیں۔ آخر ہم قرآنِ پاک کو وہ تصور کیوں دینا چاہتے ہیں جس تصور کو خود خدا نے پسند نہیں فرمایا۔

قرآن شریف کیا ہے۔ فرمایا کہ یہ راہنمائی ہے، یہ روشنی ہے، یہ وحی ہے، یہ کتاب ہے، یہ بہترین عبادت ہے، یہ اصولوں کی وضاحت کرتا ہے، یہ سچائی ہے، یہ کامیابی کی طرف لے جانے والا راستہ ہے، یہ آپ کو خوشحالی اور روشنی کی طرف لے جانے والا ہے، یہ شکوک و شبہات دور کرنے والا ہے، یہ یاددہانی ہے، یہ انسانیت کو مخاطب کرتا ہے، یہ واضح اور صاف ہے، یہ رحمت خداوندی ہے، یہ خالص ہے۔

ش۔ بنیادی طور پر قرآن پاک میں جس بات پر زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے (چیپٹر ۲۴۔ ورسز ۵۵) کہ اسلامی مملکت میں حکومت کی بنیادی ذمہ داری امن قائم کرنا اور معاشرے سے خوف اور خطر کو دور کرنا ہے۔ یہی اسلام ہے۔ یہی اسلامائزیشن ہے۔ اگر ہم ملک سے اقتصادی، سیاسی، سماجی اور مذہبی خطرات کو دور نہیں کر سکتے اور اگر زندگی کے، آزادی کے، مال و جان کے تحفظ کی ضمانت نہیں دی جا سکتی تو ہمیں اسے اسلامی حکومت کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مذکورہ حوالے کی روشنی میں ایک اسلامی اور مجاز حکومت کا امتحان ہی یہ ہے کہ وہ کس حد تک ملک میں امن قائم رکھ سکتی ہے۔ اس بنیاد کے بغیر آپ اسلامائزیشن کی توقع نہیں کر سکتے۔

لوگوں کو شبہ ہے کہ جس تیزی کے ساتھ شریعت بل کو پیش کر کے اور مختلف تجاویز اور ترامیم پر غور کئے بغیر اسے منظور کرایا گیا ہے۔ یہ ایک سیاسی ہتھکنڈہ ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کی توجہ ملک بھر اور خصوصاً سندھ میں امن و امان کی بگڑتی ہوئی صورتحال سے ہٹائی جائے۔ اس کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ بہت سے اختیارات صوبوں سے وفاق کو منتقل کر دیئے جائیں اور اس طرح (سیکشن ۲۰) مملکت کی مشینری کو عوام کے خلاف انسانی حقوق کی علمبردار تنظیموں کے خلاف، پریس کے خلاف، جمہوریت پسندوں کے خلاف مضبوط کر کے صف آرا کیا جائے۔

شاعرِ مشرق اور ممتاز مسلمان دانشور علامہ اقبالؒ نے واضح طور پر فرمایا تھا کہ قرآن شریف اور سنت کی تشریح کا حق ملاؤں کی بجائے عوام کے نمائندگان کو حاصل رہنا چاہیئے۔"

اب جبکہ مرکز میں آپ کی پارٹی برسرِ اقتدار ہے اور صوبوں میں بھی کم و بیش اسی پارٹی کی حکومت ہے، کیا

آپ ۱۹۸۵ء کے صدارتی آرڈیننس نمبر ۱۷ کو کالعدم قرار دلوا کر قرآنِ پاک کی سچائی کو مختلف فرقوں کی الگ الگ تشریحات سے بچانے کی سعادت حاصل کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں؟

بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) اعزاز الدین احمد خان
لاہور چھاؤنی

صیام سے مفہوم اور مقصود

کیا تھا اور کیا رہ گیا ہے

صوم

روزہ کے لئے قرآنِ حکیم میں صوم کا لفظ آیا ہے جس کے بنیادی معنی اپنے آپ کو روکنے یا ضبطِ نفس کے ہیں یعنی اپنے آپ کو حدودِ خداوندی کے اندر رکھنا۔ صائم کے معنی ہیں اپنے آپ کو غلط راستوں سے روکنے والا۔ اپنے آپ پر ضبط رکھنے والا۔ اصطلاح میں اس کے معنی صبح سے رات تک خورد و نوش اور جنسی اختلاط سے باز رہنے کے ہیں۔ مقصد اس سے مومنین کو سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنانا ہے۔ شہرِ رمضان کے روزے، اپنی روح کے اعتبار سالانہ عسکری ٹریننگ کا کورس ہے۔ اس لئے کہ اسلام میں ہر مسلمان سپاہی ہوتا ہے۔ سپاہیانہ زندگی میں ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں (اور بالعموم ہوتے ہیں) جن میں حلال و طیب چیزوں کے استعمال سے بھی رکنا پڑتا ہے — حالتِ جنگ میں یا تو وہ ملتی ہی نہیں یا کھانے پینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ اس لئے ضروری ہوگا کہ حالتِ امن میں، قرآنی ہدایت کی روشنی میں، ان چیزوں کے استعمال پر کچھ وقت کے لئے خود پابندی عائد کر لی جائے۔ تاکہ قوتِ برداشت بڑھے۔ اس کا نام ہے صوم (جمع صیام)۔ اگر صوم کا ترجمہ "روزہ" کرنے کے بجائے ضبطِ نفس (ڈسپلن) کیا جائے تو وہ قرآنی مفہوم سے زیادہ قریب ہوگا۔ سورۂ احزاب میں مومن مردوں اور عورتوں کی جن نمایاں خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں "اَلصَّآئِمِیْنَ وَ الصَّآئِمٰتِ" بھی ہے (۳۳/۳۵)۔ اس کا ترجمہ "روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں" قرآنی مفہوم کو واضح نہیں کرے گا۔ اس کا مفہوم ہوگا "ہر اس بات سے رُک جانے والے جس سے رکنے کے لئے کہا جائے"۔ یعنی اپنے آپ پر ضبط رکھنے والے، ڈسپلن کے پابند۔

سوال جو ذہن میں ابھرتا ہے، یہ ہے کہ ضبطِ نفس (صیام) کے اس پروگرام سے منشائے خداوندی کیا ہے؟ یعنی صیام کا قانون کیوں دیا گیا ہے۔ اس کی غرض و غایت کیا ہے، اس کا مفہوم اور مقصود کیا ہے۔ اس کی حکمت کیا ہے؟

صیام کی غرض و غایت

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (۲/۱۸۳) "تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں" قانون ہے اور لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۲/۱۸۳)، لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۲/۱۸۵) اور لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (۲/۱۸۵) اس قانون کی غایات ہیں، اس کی حکمتیں ہیں جن پر غور و فکر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ صیام کے پروگرام کا مقصد کیا ہے۔ اس سے ہو گا کیا، اس سے نتیجہ کیا نکلے گا؟

جب کوئی ڈکٹیٹر قانون نافذ کرتا ہے تو وہ اس کی حکمت (غرض و غایت) نہیں بتاتا۔ وہ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا۔ اس کا لفظ قانون ہوتا اور اس کی طوعاً و کرہاً فرمانبرداری ہر ایک کا فریضہ۔ لیکن جب کوئی عادل حکمران، قانون نافذ کرتا ہے تو وہ اس کی غرض و غایت اچھی طرح ذہن نشین کراتا ہے تاکہ لوگ سمجھ لیں کہ وہ ان کے فائدے کے لئے وضع اور نافذ کیا گیا ہے اور اس طرح اس کی اطاعت کا جذبہ ان کے دل کی گہرائیوں سے اُبھرے۔

اللہ تعالیٰ، ڈکٹیٹر نہیں، حکیم ہے۔ اس لئے اس نے کتاب (ضابطۂ قوانین) دی تو اس کے ساتھ ان قوانین کی حکمت (غرض و غایت) بھی خود ہی واضح کر دی۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ جب ہم ان قوانین کی اطاعت کریں، تو ساتھ کے ساتھ اسے بھی چیک کرتے جائیں کہ اس سے وہ مقصد حاصل ہو رہا ہے یا نہیں جسے ان کی غائیت بتایا گیا تھا، اگر ایسا ہو رہا ہے تو ان قوانین پر ٹھیک ٹھیک عمل ہو رہا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہو رہا تو کہیں غلطی ہے اسے درست کر لینا چاہیئے۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ قرآنِ حکیم نے صیام کی تین غایات بیان کی ہیں۔ یعنی یہ بتایا ہے کہ ضبطِ نفس (صیام) کے پروگرام کا مقصد کیا ہے۔ اس سے ہو گا کیا۔ اس سے نتیجہ کیا نکلے گا؟ اگر وہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا جو ہونا چاہیئے تو دیکھنا ہو گا کہ کہاں غلطی ہو رہی ہے۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ صیام سے ایسا ہو گا تو اس سے وہ نتیجہ لازمی طور پر نکلنا چاہیئے۔ اس لئے کہ یہ نتیجہ بھی خود اللہ تعالیٰ ہی کا بتایا ہوا ہے جو کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ یاد رہے کہ دین (قرآنی نظام) میں ہر حکم اپنا متعین نتیجہ مرتب کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ مقصد تھا کِتَابٌ (قانون) کے ساتھ حکمت (اس کی غرض و غایت) کے مُنزل مِنَ اللہ ہونے کا۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ "حکمت" وحیٔ غیر متلوّ" ہے صحیح نہیں۔ حکمت قرآنِ کریم کے اندر ہے، قرآنِ حکیم سے باہر نہیں (۴/۱۱۳؛ ۲/۱۵۱؛ ۳۳/۳۴)۔

اب آیئے صیام کے قانون کے نتائج کی طرف۔ اگر عمل قرآنِ حکیم کے منشاء کے مطابق ہو رہا ہے تو:۔

(۱) صیام کے پروگرام کا پہلا نتیجہ "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" نکلے گا۔ اس کا ترجمہ عام طور پر یہی کیا جاتا ہے "تاکہ تم پرہیزگار بنو"۔ اس سے تقوے کا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ تقوے میں راستے کے خطرات سے بچ کر چلنے

کے ساتھ ساتھ قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا بھی ہے۔ لہٰذا صیام کے پروگرام کا پہلا نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم زندگی کے خطرات کا مقابلہ کرنے اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ تمہاری قوتِ برداشت بڑھ جائے گی اور تمہارے اندر ڈسپلن پیدا ہو جائے گا۔

(۲) صیام کا دوسرا نتیجہ "لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ" (۲/۱۸۵) ہے۔ "شکر" کا مطلب ہوتا ہے انسانی کوششوں کا بھرپور نتیجہ برآمد ہونا۔ لہٰذا کہا یہ گیا ہے کہ صیام کے پروگرام سے تم میں جو برداشت کی قوت اور ڈسپلن کی صلاحیت پیدا ہو گی، اس سے تمہاری کوششیں پوری طرح ثمر بار ہو جائیں گی۔

(۳) اس سے سوال یہ ابھرا کہ کوششیں تو کسی مقصد کے حصول کے لئے ہوتی ہیں۔ وہ مقصد کیا ہے جس کے لئے یہ جانکاہ کوششیں کی جائیں گی اور وہ بھرپور نتائج مرتب کریں گی۔ اس مقصد کو "لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ" (۲/۱۸۵) کی نہایت جامع اصطلاح میں سمٹا کر بیان کر دیا ہے۔ لہٰذا صیام کے پروگرام کا اصل مقصد ہے: لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ" (۲/۱۸۵)۔ یاد رکھو! روزے محض رسم پوری کرنے کے لئے نہیں۔ ان سے مقصد یہ ہے کہ تم اس قابل ہو جاؤ کہ اللہ نے جو راہ نمائی تمہیں عطا کی ہے، اس کے ذریعے سے تم اللہ تعالیٰ کی کبریائی یعنی اُس کے غلبہ و اقتدار کو انسانی دنیا میں ثبت (ESTABLISH) کر سکو۔ بالفاظِ دیگر دینِ خداوندی کو تمام نظامہائے عالم پر غالب کر سکو (۹/۳۳) اور اس مقصد کے لئے تم جو کوشش کرو، وہ بھرپور نتائج کی حامل ہو۔ غور فرمایا آپ نے کہ صیام سے مفہوم اور مقصود کیا تھا؟

اصل یہ ہے کہ "تکبیر اللہ" دین کی غایت اور جماعتِ مومنین (امتِ مسلمہ) کا منتہائے مقصود ہے۔ یہ اُمت جیتی ہے تو اس کے لئے۔ اس کی تمام جدوجہد ہوتی ہے تو اس کے لئے اور مرتی ہے تو اس کی خاطر۔ پھر سن لیجئے کہ صیام کے پروگرام کا مقصد ہے لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (۲/۱۸۵) تاکہ تم اس قابل ہو سکو کہ اللہ کی عطا کردہ (DIRECTIVES) کے مطابق وہ نظام قائم کر دو جس میں تم ساری دنیا میں اعلان کر سکو کہ کبریائی (حقِ حکومت) صرف اللہ سبحٰنہٗ وتعالیٰ کو حاصل ہے (۱۲/۴۰؛ ۱۸/۲۶؛ ۱۷/۱۱۱؛ ۱۲/۴۰)۔ صیام کے پروگرام کے علاوہ قرآن کریم نے حج کے پروگرام کے متعلق بھی فرمایا ہے لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (۲۲/۳۷)۔ یعنی حج کی غایت بھی اللہ کی کبریائی ثبت کرنے کا عملاً پروگرام ہے۔

اللہ کی کبریائی

سورۂ جاثیہ میں ہے:

وَ لَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۴۵/۳۷)

"خارجی کائنات اور انسانی دنیا میں کبریائی اسی کی ہے (یعنی اللہ کی)۔ وہ انتہائی غلبہ کا مالک ہے لیکن اس کا غلبہ حکمت پر مبنی ہے۔"

خارجی کائنات میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی مسلّم ہے۔ جہاں تک انسانی دنیا کا تعلق ہے اس کے لئے بھی اللہ نے قوانین متعین کر دیئے ہیں لیکن یہاں یہ قوانین از خود نافذ العمل نہیں۔ یہ (قوانین) انسانی ہاتھوں سے نافذ ہونگے۔ ان قوانین کو انسانی دنیا میں نافذ کرنا اللہ کی کبریائی ثبت کرنا کہلائے گا۔ ان کا نفاذ جماعتِ مومنین، اُمتِ مسلمہ کا فریضہ حیات ہے۔ اس کو اللہ کی حکومت یا دین کا نظام کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی حکومت، اس کا غلبہ و تسلّط، اس کے اقتدارِ مطلق، اس کی کبریائی سے مراد ہوگا اللہ کی کتاب کی حکومت۔ حضور نبی اکرمؐ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآنِ حکیم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی بالفاظِ دیگر حکمرانی اللہ کی کتاب۔ القرآن۔ کی تھی۔ حضورؐ کے بعد، یہ قرآنی نظام خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں آگے چلا۔ دورِ خلافتِ راشدہ میں امورِ مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو رسول اللہؐ کے زمانے میں رائج تھا۔ یعنی قرآنِ حکیم کے احکام و قوانین کی اطاعت۔ کیونکہ مقصد اللہ کی کبریائی (اللہ کی حکومت) قائم کرنا تھا۔ بدقسمتی سے یہ نظام باقی نہ رہا لیکن لوحِ زمانہ پر اس کی یادگار اب تک منقوش ہے۔

اس قرآنی نظام کا دوبارہ قیام اُمتِ مسلمہ کی اجتماعی ذمہ داری ہے تاکہ دنیا میں اللہ کی کبریائی قائم ہو سکے جو دین کا تقاضا ہے۔ یہی پیغام لے کر ماہِ صیام ہر سال آتا ہے لیکن ہم ٹس سے مس نہیں ہوتے کیونکہ مذہبی پیشوائیت نے صیام کا اصل مقصد ہماری نگاہوں سے اوجھل کر دیا ہے۔ دین کو مذہب سے بدل دیا ہے۔

مذہب میں صیام

امتِ مسلمہ کا مقصدِ حیات دنیا میں نظامِ خداوندی کا غالب کرنا تھا تاکہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی قائم ہو سکے لیکن اس کے مذہبی پیشواؤں نے یہ مقصد اس کی نگاہوں سے اوجھل کر کے، اس کے سامنے انفرادی نجات کو مقصودِ زندگی بنا کر رکھ دیا۔ اس سے صیام کا مفہوم اور مقصود کچھ سے کچھ ہوگیا۔ اب اس سے علماء کرام کا فریضہ نظامِ خداوندی کو دیگر نظامات پر غالب کرنا نہ رہا بلکہ دیگر مذاہب کے مقابلہ میں مذہب اسلام کی افضلیت ثابت کرنا رہ گیا۔ اسے کہتے ہیں دین کو مذہب سے بدل دینا۔ اب ہمارے سامنے دین کا تصور نہیں، اپنی اپنی نجات کی فکر ہے۔ اس غیر قرآنی سوچ کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔

(ضمناً) مروجہ روزوں میں کھانے پینے وغیرہ کی پابندی سے تو حکمِ خداوندی کی تعمیل بدیہی تھی، وہ کر لی گئی "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" کا مقصد اپنے آپ کو متقی پرہیزگار کہہ لینے سے حاصل کر لیا۔ "لعلکم تشکرون"

کے متعلق کہہ لیا کہ حجۃ الوداع درحقیقت بارگاہِ خداوندی میں ہدیۂ تشکر پیش کرنے کے لئے ہے کہ اس نے ہمیں روزے رکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔ "لتکبروا اللہ علیٰ ما ھدٰکم" ذرا مشکل مرحلہ تھا۔ اس کے متعلق یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان دلا لیا کہ یہ جو نمازِ عید میں چھ زائد تکبیریں کہی جاتی ہیں اس سے یہ فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ غور فرمایا آپ نے، مذہب میں آکر صیام کا مفہوم کیا رہ گیا ہے!

ظاہر ہے کہ یہ مذہبی مقاصد کفار کی حکومت میں بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ تحریکِ پاکستان کے دوران نیشنلسٹ علماء کا یہی موقف تھا۔ ان حضرات کی شدید مخالفت کے باوجود ہم نے پاکستان حاصل کر لیا۔ لیکن اس قرآنی حکومت کی راہ میں یہ مذہبی پیشوا بدستور رکاوٹ بنے ہوتے ہیں (۹/۳۴) جس کے قیام کے لئے یہ خطۂ ارض حاصل کیا گیا تھا۔

علامہ اقبالؒ نے سچ کہا تھا:

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے — وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج — یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

پی ٹی سی ٹیچر ۔ سندھو ۔ عمر ۲۷ سال، رہائشی حمید پور خورد (گاؤں) کیلئے
لاہور سے رشتہ مطلوب ہے۔
لڑکی میٹرک سے کم اور ۲۷ سال سے زائد عمر کی نہ ہو۔
رابطہ
شام ۔ معرفت ادارہ طلوعِ اسلام، ۲۵/بی گلبرگ ۲۔ لاہور

بشیر احمد عابد ۔ کویت

قرآن فہمی کے کلیدی اصول

طلوعِ اسلام کے گذشتہ شمارے میں ممبرانِ قومی اسمبلی کے نام ایک کھلی چٹھی شائع ہوئی جس میں ان سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ قانون سازی کا فریضہ قرآنِ کریم کی روشنی میں سرانجام دیں۔ اس کے ساتھ یہ پیشکش بھی تھی کہ اگر آپ کو قرآن فہمی میں کوئی دشواری پیش آئے تو اس ضمن میں ادارہ طلوعِ اسلام آپ کی ہر مدد کرنے کو تیار ہے۔ چونکہ میں اپنے آپ کو ادارہ طلوعِ اسلام کا ایک ادنیٰ خادم گردانتا ہوں لہٰذا خدمت گذاری کے اس احساس کے ساتھ ہی قلم ازخود حرکت میں آگیا۔ سوچا۔ معزز ممبرانِ اسمبلی کو اتنی فرصت کہاں جو یہ زحمت گوارا کرسکیں۔ کیوں نہ خود ہی قرآن فہمی کے بنیادی اصولوں کو کھول کر بیان کردیا جائے تاکہ قرآن کا ہر طالب علم ازخود اس قابل ہوجائے کہ اسے اس راہ میں کسی کی انگلی پکڑنے کی ضرورت باقی نہ رہے۔

قرآنِ کریم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ

ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے بڑا آسان بنادیا ہے۔ سو ہے کوئی جو اس پر غور و فکر کرکے اس سے نصیحت حاصل کرے؟ (۵۴ : ۱۷)

لیکن یہی بات اگر آپ کسی عالمِ دین سے پوچھیں گے تو وہ کبھی ایسا نہیں کہے گا۔ کیونکہ ان کے نزدیک قرآن سمجھنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں! ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ ایسا کہنے میں حق بجانب ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو غنی و حمید ہے اسے نہ روٹی کا مسئلہ نہ ہی حمد و ستائش کی تمنا! مولوی بے چارہ اگر یہ کہہ دے کہ قرآن سمجھنا آسان ہے تو پھر اس کا دھندا کچھ باقی نہیں رہتا۔ قرآن کے صدقے اسے روٹی مل رہی ہے اور قرآن ہی کے صدقے اس کی قدر و منزلت ہے۔ قرآن مولوی کا پیشہ ہے۔ اس کی روزی اور عزت کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا ایک منجھے ہوئے پیشہ ور کی طرح وہ اس راز کو کبھی افشا نہیں کرے گا کہ قرآن سمجھنا آسان ہے۔

بظاہر یہ بات مبالغہ آمیزی کہلائے گی لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اسلام کو سب سے زیادہ نقصان پیشہ ور علماء نے پہنچایا ہے۔ ان کی افتراء پردازیوں اور کذب بیانیوں سے مسلمان حق وصداقت کی راہ سے کافی دُور نکل چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے دینِ اسلام کو اس لئے پسند فرمایا تھا کہ ہم اس کے حیات بخش اصولوں پر عمل پیرا ہو کر باطل کی قوتوں کو شکست دیں اور نوعِ انسان کو حقیقی فوز و فلاح سے ہمکنار کریں۔ یہ دین باطل کی قوتوں کا زبردست توڑ تھا۔ اس کے مقابل باطل کی ایک قوت بھی پنپ نہیں سکتی تھی۔ وہ یوں کہ اس نظام میں کوئی کسی کی محنت کا استحصال نہیں کر سکتا تھا اور نہ کسی کی یہ مجال ہوتی کہ وہ دوسروں کے حقوق کو پامال کر سکے۔ اس نظام کے کارپرداز اس قدر صاحبِ بصیرت اور صاحبِ قوت ہوتے ہیں کہ وہ ہر ظالم کی کلائی کو اٹھنے سے پہلے ہی مروڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے ان کا ذکر ان خوبصورت الفاظ میں کیا ہے:

اَلصّٰبِرِیْنَ وَ الصّٰدِقِیْنَ وَ الْقٰنِتِیْنَ وَ الْمُنْفِقِیْنَ وَ الْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ ؕ

یہ لوگ اپنے مقصدِ حیات پر چٹان کی طرح قائم ہوتے ہیں۔ اپنی ہر بات کو عملاً سچ کر کے دکھاتے ہیں۔ اپنے وسائل کو ٹھیک ٹھیک پیمانوں سے استعمال کرتے ہیں محنت سے کماتے ہیں اور بقدرِ ضرورت رکھ کر باقی سب حاجت روائی کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔ اپنے پروگرام کو شروع کرنے سے پہلے اس کی مکمل تیاری کر لیتے ہیں تاکہ اسے باحفاظت کامیابی سے ہمکنار کر سکیں۔" (۳/۱۷)

آپ سوچئے! جس نظام کے علمبردار ان بلند صفات کے حامل ہوں وہ نظام کیسے ناکام ہو سکتا ہے؟ افلاکِ تدبّر وسیاست کے ان شاہین صفت انسانوں کی پروازیں کوتاہی کیسے آسکتی ہے؟ بیشۂ حق وصداقت کے ان شیروں کو کیسے شکست دی جا سکتی ہے؟ ایسا صرف اس صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ یا تو موت انہیں اس نظام سے جدا کر دے یا پھر ایسی چال چلی جائے کہ ان کے بعد آنے والی نسلیں اس نظام کے حقیقی خدّوخال سے ناآشنا ہو جائیں۔ یعنی نظام تو باقی رہے لیکن اس قدر مسخ کر دیا جائے کہ اس کے نقوش کو پہچاننا مشکل ہو جائے۔ اسلام دشمن قوتوں نے یہی کچھ کیا اور اس مقصد کے لئے انہوں نے ہمارے علماء کو استعمال کیا۔ کیونکہ یہ کام انہی کی وساطت سے بخوبی سرانجام دیا جا سکتا تھا۔ ہمارے علماء جس طرح کہ آجکل ان قوتوں کا آلۂ کار بن جاتے ہیں اور انہیں خبر تک نہیں ہوتی، اسی طرح اسلام کے اوّلیں سنہری دَور کے بعد جب ان کی پہلی کھیپ تیار ہوئی تو یہ ان باطل قوتوں کی گہری سازش کا شکار ہو گئے۔ اس دَور میں ان قوتوں کو تازہ تازہ شکست ہوئی تھی۔ اسلام کی عدل ومساوات پر مبنی تعلیمات نے حرص وہوس کے پیکر، قوت واقتدار کے بھوکے، دولت وشہرت کے پیاسے

بھیڑیا نما انسانوں سے ان کا سب کچھ چھین لیا تھا اور وہ ایک زخمی درندے کی طرح اسلام کے درپے ہو چکے تھے۔

مسلمانوں کی قوت اور علم و بصیرت کا سرچشمہ قرآن کریم کی روشن اور حیات بخش تعلیمات تھیں۔ انہیں ان تعلیمات سے محروم کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ باطل کی قوتوں نے کیا یہ کہ قرآنی تعلیمات کے خالص اور حقیقی مفاہیم کو نہایت شاطرانہ طور پر بدل دیا اور اس کے حرارت آمیز تصورات میں انسانی خیالات اور جذبات کی آمیزش کر کے انہیں راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا اور انہوں نے یہ سب کچھ مذہبی پیشوائیت کے ہاتھوں سرانجام دلوایا۔ ویسے بھی یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ خدا کے دین کو مسخ کرنے کا یہ طریقہ کار ازل سے چلا آ رہا ہے۔ تورات و انجیل کو بھی مذہبی پیشوائیت نے مسخ کیا اور آج قرآن کی تعلیمات پر بھی خطِ تنسیخ پھیرنے والا یہی طبقہ ہے۔ ابتدا سے ہی یہ طبقہ وحیٔ خداوندی کی انسان دوست اور عوام پرور تعلیمات کو اپنی شرح و تفسیر سے بالادست طبقوں کے مفاد کے تحفظ کے لئے استعمال کرتا رہا ہے۔ انفرادی اور قومی خود غرضی، استحصالِ محنت اور فرقہ واریت کو جائز قرار دیتا رہا ہے اور اس خدمت کے عوض اسے نہ صرف روٹی کا تحفظ حاصل رہا ہے بلکہ جبہ و دستار کی فضیلت سے بھی نوازا جاتا رہا ہے۔ ہر نمرود کو اپنی آتش سامانیوں کے لئے ایک آذر کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر فرعون کو اپنی خون آشامیوں کے لئے ہامانی جنود درکار ہوتے ہیں۔ جب تک حضرتِ مُلّا ظالم کی کھیتی کی آبیاری نہ کرے وہ کبھی پروان چڑھ نہیں سکتی۔ اسی لئے ہر ظالم خواہ وہ کسی ملک کا حکمران ہو، کسی جاگیر کا چوہدری یا کسی قبیلے کا سردار، اپنے شیطانی اعمال کے حق بجانب ہونے کی شہادت ہمیشہ مولوی سے لیتا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے اسلام کی جو شکل ہے وہ سراسر غیر قرآنی ہے۔ یہ وہ اسلام ہے جسے باطل قوتوں نے اپنی مفاد پرستیوں کی حفاظت اور عیش سامانیوں کے لئے وضع کیا تھا۔ یہ جابر اور مستبد حکمرانوں کا اسلام ہے! استحصالی اور خون آشام سرمایہ داروں کا! اذیت پسند صوفیوں کا! ضدی اور ہٹ دھرم ملاؤں کا! یہ وہ اسلام نہیں جسے انبیاء کرامؑ نے اپنی کشادہ نگہی اور وسیع القلبی سے شرف بار کیا تھا۔ صالحین نے اپنے صلاحیت بخش کارناموں سے لازوال بنایا تھا۔ جس کے ایک ایک دعویٰ ایمانی کو صدیقین نے سچ کر دکھایا تھا اور جس کے چمن کی آبیاری شہدائے کرام نے اپنے خونِ جگر سے کی تھی! یہی وجہ ہے کہ آج کا مسلمان اپنے سفرِ زندگی میں ایسے حسین رفقاء کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مروجہ اسلام میں یہ سکت ہی نہیں کہ وہ ذلت و رسوائی کے بحرِ عمیق میں غرق شدہ انسانیت کو سطحِ آب پر لا کر ایسا نشاط انگیز بنا دے کہ وہ زندگی کی مسابقت میں عزّ و شرف کے ساتھ شریک ہو سکے۔ یہ باطل قوتوں کا تراشیدہ اسلام ہے اور ہر باطل نظام کی طرح اس کی بنیادیں بھی تقلید، اسلاف پرستی اور کثرتِ اجماع پر رکھی ہوئی ہیں۔ اسی لئے جب بھی کوئی اختلافی مسئلہ سامنے آتا ہے تو اسے دلائل و براہین سے سمجھنے کی بجائے ہمیشہ اسلاف کے اقوال اور کثرتِ اجماع پر انحصار کیا جاتا ہے۔ ہمارے آج کے علماء بھی باطل کی اس

سازشِ کہنہ کا شکار ہو گئے ہیں اور خود کو اپنے ہاتھوں اسلاف پرستی کے شکنجہ میں کس لیا ہے۔ چونکہ ان کی اکثریت قرآنِ کریم کا مطالعہ نہیں کرتی (تلاوت کرتی ہے) لہٰذا یہ گرفت دن بدن گہری ہوتی جا رہی ہے۔ یہ حضرات قرآنِ کریم محض ثواب کی خاطر پڑھتے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے اپنی من گھڑت شریعت میں اس کا نام وحیٔ متلو رکھا ہوا ہے۔ یعنی صرف تلاوت کے لئے اور دوسرے لوگوں کو بھی یہی وعظ و نصیحت کرتے رہتے ہیں۔ نتیجۃً، آج پوری اُمّت ظلمات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی ہے۔ قرآن اپنے آپ کو نور کہتا ہے۔ یعنی خود روشن اور روشنی عطا کرنے والا! لیکن شومئ قسمت دیکھئے کہ آج دنیا میں سب سے زیادہ جہالت زدہ اور علم سے بے بہرہ خود مسلمان قوم ہے۔ اگر ہماری مذہبی پیشوائیت قرآنِ کریم کی صحیح تعلیمات سے آگاہ ہوتی تو آج اس کتابِ عظیم کی حکمت و بصیرت ہماری رگ رگ میں رچی بسی ہوتی۔ یہ کتاب ہمارے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب کا اہم ترین جزو ہوتی اور جس طرح ہم دیگر مضامین مثلاً اُردو، انگلش، حساب وغیرہ بتدریج پڑھ کر ان پر عبور حاصل کر لیتے ہیں۔ اسی طرح قرآنِ کریم کا نصاب بھی مرتب کیا جاتا اور جب کوئی بچہ گریجوایشن کر کے نکلتا تو وہ دیگر علوم کے ساتھ ساتھ قرآنِ کریم پر بھی گہری بصیرت رکھتا اور اسے خوب معلوم ہوتا کہ ایک ضابطۂ حیات کی کیا اہمیت ہوتی ہے؟ یہ کتاب زندگی کے مسائل کے حل کے لئے عملی اصول دیتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ عملی اصول اسی صورت میں صحیح نتیجہ پیدا کر سکتا ہے جب اس کے ہر جزو، اجزاء کی ترتیب اور اس کے مجموعی طریقِ عمل کا صحیح صحیح علم ہو۔ اگر ان میں سے کسی ایک عنصر کے سمجھنے میں بھی غلطی ہو جائے تو وہ اصول کبھی صحیح نتائج مرتب نہیں کرے گا اور انسان کی ساری محنت رائیگاں جائے گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ قرآنِ کریم کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں اور اسے ضابطۂ حیات سمجھتے ہیں ان کے لئے اس کتاب کا صحیح طور پر سمجھنا کس قدر ضروری ہے۔ ان کی تو زندگی اور زندگی کی کامیابیوں کا دارومدار ہی اس پر ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ایک عرصہ تک اس کتابِ عظیم کی یہ حیثیت اور اس کے سمجھنے کی اہمیت ہماری نگاہوں سے اوجھل رہی۔ لیکن مقامِ مسرت ہے کہ اب رفتہ رفتہ اس بلند و بالا کتاب کا صحیح مقام سامنے آ رہا ہے اور اسے سمجھ کر پڑھنے کی اہمیت نمایاں ہو رہی ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا رجحان اس کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس کے حقائق کو بے نقاب دیکھنے کی تڑپ ان کے دل میں پیدا ہو رہی ہے۔ لیکن اسے شکایت ہے کہ مروّجہ ترجموں سے قرآن کریم سمجھ میں نہیں آتا اور تفاسیر اس الجھن میں مزید اضافہ کر دیتی ہیں۔ اس ضمن میں کہا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم نبیٔ اکرمؐ پر نازل ہوا اور حضورؐ نے اسے صحابہؓ کی جماعت کو سمجھایا۔ ظاہر ہے کہ اس آسمان کے نیچے اس ذاتِ اقدس و اعظم سے بہتر نہ تو کوئی قرآن کو سمجھانے والا ہو سکتا ہے اور نہ قدوسیوں کی اس جماعت سے بہتر سمجھنے والا! اس لئے ہمیں قرآن فہمی کے سلسلے میں کسی اور طرف رُخ کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ بالکل بجا اور درست ہے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ جو کچھ حضورؐ نے سمجھایا تھا وہ اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں ہم تک نہیں پہنچا۔ اس کا واضح اور بیّن ثبوت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی جس تفسیر کو نبیٔ اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ وہ حضورؐ کی حقیقی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ اگر آپ تفصیل جاننا چاہتے ہیں، تو صحیح بخاری (یا صحاح ستہ میں سے کسی کتاب) میں تفسیری روایات ملاحظہ فرمالیں۔ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ روایات حضورؐ کے ارشاداتِ گرامی نہیں ہو سکتے اور نہ ہی ان کی رُو سے قرآن کریم سمجھ میں آسکتا۔

قرآنِ کریم کو سمجھنے کے چند کلیدی اصول ہیں اور ان کا تعین بھی خود قرآنِ کریم نے ہی کیا ہے۔ قرآنِ کریم کے احکام و تعلیمات کی صحیح تشریح و تعبیر انہی اصولوں کی روشنی میں ممکن ہے۔ قرآنِ کریم اصولوں سے بحث کرتا ہے۔ اس لئے کہ اصولوں کا اطلاق زمان و مکان کی قید سے ماورا ہوتا ہے۔ ایک ایک اصول ہزارہا معاملات کو محیط ہوتا ہے اور ہر معاملے کو سرانجام دینے کے لئے ہزارہا آپشن (OPTIONS) ہوتی ہیں۔ اصولوں کی موجودگی میں یہ منطق بے معنی ہو جاتی ہے کہ یہ بات فلاں عالم نے کہی ہے یا فلاں کتاب میں مذکور ہے۔ اصولوں پر مبنی تشریح اور تفہیم انسانی فکر و تدبر سے منسلک ہو جاتی ہے اور اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جوں جوں انسانی سوچ و فکر کی نشوونما ہوتی ہے اس کے علم میں اضافہ اور پختگی آتی ہے۔ قرآنی تعلیمات کی بہتر سے بہتر تشریح کی جاسکتی ہے۔ چونکہ کائنات کی ہر شے تغیر پذیر ہے۔ لہٰذا مسائل و معاملات کی نوعیت آئے دن بدلتی رہتی ہے۔ ان کے نئے نئے زاویے سامنے آتے رہتے ہیں۔ لیکن اصول سامنے ہوں تو ان کے سمجھنے اور حل کرنے میں ذرہ بھر دشواری نہیں ہوتی۔ کیونکہ اصولوں کو ثبات حاصل ہے اور یوں تغیر و ثبات کے حسین امتزاج سے کائنات کے حسن کو جدت اور تازگی بہم پہنچتی ہے۔ اس تمہیدی گفتگو کے بعد اب آیئے ایک نظر ان اصولوں پر ڈالئے جو اگر سامنے ہوں تو قرآنِ کریم کے حقیقی اور خالص مفاہیم سمجھنا دشوار نہیں رہتا ہے۔

اس ضمن میں پہلا اصول یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا مطالعہ ہمیشہ خالی الذہن ہو کر کرنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۙ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۙ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ؕ

"یہ قرآن نوعِ انسان کے لئے انتہائی منفعت بخش ہے۔ اسے ایک محفوظ کتاب کے اندر رکھ دیا گیا ہے اور اس کے حقائق سے وہی لوگ صحیح معنوں میں مطلع ہو سکتے ہیں جنہیں قلب و دماغ کی پاکیزگی نصیب ہو۔" (۷۹ — ۷۷ : ۵۶)

لفظ "مطہرون" میں بدنی طہارت کے ساتھ ذہنی طہارت بھی لازمی شامل ہے۔ اگر ذہن پہلے سے ہی عقائد و نظریات سے مغلوب ہو تو پھر قرآنِ کریم کے حقیقی مفاہیم کو حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً ہمارے ہاں یہ عقیدہ

ہے کہ اولیاء اللہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو کرامات وخوارق کا مظاہرہ کریں حالانکہ اصحابہ کرامؓ اس مفہوم سے قطعی نامانوس تھے۔ قرآن میں لفظ "الولی" کے معنی مددگار، حمایتی اور دوست کے ہیں۔ اولیاء اللہ کے معنی وہ اہلِ ایمان وتقوےٰ ہیں جو اللہ کے دین کے حامی و مددگار بنیں۔ لہٰذا جو لوگ راسخ العقیدہ ہوں گے ان کو یہ قرآنی مفہوم مشکل سے سمجھ میں آئے گا۔ ویسے بھی یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس دینِ حنیف کی ابتداء وادیٔ غیر ذی زرع سے ہوئی تھی۔ قطع نظر اس کے کہ اس وادی میں زراعت ہوتی تھی یا کہ نہیں، یہ زمین ہر طرح کی نظریاتی چپقلشوں سے پاک وصاف تھی جس کی بنا پر یہاں ایک ایسی زبان کو فروغ حاصل ہوا جس کے الفاظ بیّن اور تصورات غیر مبہم تھے اور جو قرآنِ کریم کے بلند حقائق کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی اہل تھی۔

قرآن فہمی کا دوسرا اہم اصول محاورۂ عرب سے آگاہی ہے۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں (بالخصوص حجاز وقدس میں) جو عربی زبان مروّج تھی۔ قرآنِ کریم نے اسے عربی مبین کہہ کر پکارا ہے (۱۹۵ : ۲۶)۔ اس عربی کے کلام اور کلمات کے معانی ومفاہیم نزولِ قرآن کے بعد کے زمانے کی عربی سے کافی مختلف تھے۔ مثلاً لفظ "تاویل" کا معنی "انجام کار" تھا لیکن بعد میں یہ "تفسیر" کے معنوں میں مشہور ہوگیا۔ اس لئے آج کے دور میں قرآن سمجھنے کے لئے انتہائی ضروری ہے کہ قرآن کے مفردات اور اصطلاحات کے وہی مفاہیم تلاش کئے جائیں جو زمانہ نزولِ قرآن میں مستعمل تھے۔ قرآنِ کریم نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان کو اس دور کے شعراء اپنے کلام میں کثرت سے استعمال کرتے تھے اور اس کلام کا بیشتر حصہ اپنی اصلی حالت میں عربی ادب کی کتب میں مدوّن اور محفوظ ہے۔ قرآنی مفردات کا مفہوم متعین کرنے کے لئے یہ اشعار کافی مدد کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ عربی زبان کی اپنی ایک خصوصیت ایسی ہے جس پر تھوڑے سے غور وفکر سے الفاظ کے صحیح مفہوم تک پہنچنا مشکل نہیں ہے۔ اس زبان میں ہر لفظ کا ایک مادہ (ROOT) ہوتا ہے جو اپنے بنیادی معنی رکھتا ہے۔ گرامر کے قواعد کی رُو سے اس مادّہ کی شکلیں خواہ کیسی ہی بدلتی رہیں اس کے بنیادی معنی کی جھلک ہر شکل میں موجود رہے گی۔ لہٰذا، اگر مرورِ زمانہ سے کسی لفظ میں مفہوم میں فرق بھی آجائے تو بھی اس مادہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ابتداءً وہ لفظ کس مفہوم کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس ضمن میں عربوں کا طرزِ بود و باش اور اندازِ فکر بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ عرب صحرانشین تھے اور مختصر سے سامانِ زیست کے ساتھ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی زبان کے تمام مشتقات ومصادر کا منبع محسوس ومرئی اشیاء تھیں اس لئے ان کے متعلق جس قدر الفاظ استعمال میں آتے تھے ان کا مفہوم نہایت آسانی سے ذہن میں آجاتا ہے۔ الفاظ کے صحیح مفہوم کے تعین میں دقت وہاں پیش آتی ہے جہاں وہ الفاظ فلسفہ اور مابعد الطبیعیاتی مسائل سے گفتگو میں استعمال ہوتے ہیں۔ خانہ بدوشوں اور صحرانشینوں کے ہاں موشگافیوں اور نکتہ آفرینیوں کا کیا کام؟ انہی لوگوں کی صاف ستھری، اجلی، نکھری

زبان تھی جسے عربوں کے ہاں سند مانا جاتا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں عربوں کا غیر عربوں سے خلا ملا بڑھنے لگا، تو آپ اہلِ مدینہ سے کہا کرتے تھے کہ قرآن سمجھنا چاہتے ہو تو صحرا کے بدوؤں میں جا کر کچھ دن گذارو۔ کیونکہ جس زبان میں قرآن نازل ہوا ہے، وہ زبان ان کے ہاں اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔

ان توضیحات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ لغوی اعتبار سے قرآنِ کریم کے الفاظ کا مفہوم متعین کرنے کا طریق یہ ہے کہ سب سے پہلے متعلقہ لفظ کے مادہ کو دیکھا جائے کہ اس کا بنیادی معنی اور خصوصیت کیا ہے؟ اس مادہ کی شکلیں کتنی ہی کیوں نہ بدلیں، اس کی خصوصیت کی روح بالعموم ہر پیکر میں جھلکتی رہے گی۔ اس کے بعد دیکھا جائے کہ صحرا نشین عربوں کے ہاں اس لفظ کا استعمال کس کس انداز سے ہوتا تھا۔ ان کے استعمال کی محسوس مثالوں سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ ان کے ہاں اس مادہ کا تصور (CONCEPT) کیا تھا۔ مثال کے طور پر لفظ "اثم" کو لیجئے۔ اس کے مروّج معنی "گناہ" کے ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم میں جن اشیاء اور اعمال کو "اثم" کہا گیا ہے ان کے مفاہیم اس معنی سے واضح نہیں ہوتے۔ مذکورہ بالا صدر طریق سے اس کا مفہوم متعین کیا جائے تو بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں اضمحلال، افسردگی، توانائی کا کم ہو جانا، سُست روی اور شگفتگی کا پہلو ہوتا ہے۔ عرب، اس اونٹنی کو جو تکان کی وجہ سے مضمحل ہو چکی ہو اور اس لئے بہت آہستہ آہستہ چلے یا چلنے سے جواب دے جائے "الاٰثِمَۃُ" کہتے تھے۔ قرآن کریم نے ان تمام اعمال کو اثم کہا ہے جن سے انسانی ذات میں ضعف و اضمحلال پیدا ہو جائے، جن سے اس کی قوّتِ عمل میں کمزوری واقع ہو جائے، جن سے وہ سفرِ حیات طے کرنے میں سُست گام ہو جائے، جن سے وہ دوسروں کے مقابلے میں پیچھے رہ جائے۔

چہ جائے کہ شعرائے جاہلیہ کا کلام، مادہ کے بنیادی معنی اور صحرا نشینوں کے تصوّرات، ہر سہ عناصر عربی زبان کی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر اس کے الفاظ کا صحیح مفہوم متعیّن کرنے میں زیادہ دشواری نہیں رہتی لیکن، بایں ہمہ، صرف انہی خصوصیات سے قرآنِ کریم جیسی عظیم کتاب کے الفاظ کے صحیح صحیح معنی متعیّن نہیں کئے جاسکتے۔ اس لئے کہ یہ کتاب زندگی کے ان اصولوں کا ضابطہ ہے جن میں تغیّر و تبدّل نہیں ہو سکتا اور جن کی صداقت پر ہمارا ایمان ہے۔ اس لئے یہ ازحد ضروری ہے کہ اس کا صحیح مفہوم یقینی طور پر ہمارے سامنے آجائے۔ تنہا لغت سے یہ نہیں ہو سکتا! لغت انسانی کاوش کا نتیجہ ہے جس سے سہو و خطا اور خارجی اثرات کا امکان بہرحال باقی رہتا ہے۔ علاوہ بریں، قرآنِ کریم نے بعض الفاظ کو بطور اصطلاحات استعمال کیا ہے یہ اصطلاحات اس قدر جامع ہیں کہ تنہا لغت سے وہ عظیم تصوّرات سامنے نہیں آسکتے جنہیں قرآن نے ان الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ، تقویٰ، ایمان، اسلام وغیرہ۔ ان اصطلاحات کا مفہوم خود قرآنِ کریم

سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ قرآن کا انداز یہ ہے کہ اس میں اگر ایک مقام پر ایک بات کہی گئی ہے تو دوسرے مقام پر اس کی وضاحت اس انداز سے کر دی گئی ہے کہ اس سے مقامِ اوّل کی بات کے ساتھ ساتھ اصطلاحات کا مفہوم بھی خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ اس انداز کو قرآن نے "تصریفِ آیات" سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی آیات کو مختلف مقامات پر لوٹا کر لانا اور اس طرح مطالب کی وضاحت کر دینا (۶:۱۰۶)۔ قرآن فہمی کا یہ تیسرا اصول ہے اور اس کی رُو سے قرآنی مفاہیم موتیوں کی طرح نکھر کر نگاہوں میں سما جاتے ہیں۔ اس کا اندازہ ایک مثال سے لگائیے۔ قرآنِ کریم میں ہے:

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ

"یہ حقیقت ہے کہ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" (۲/۱۵۳)

یہاں یہ نہیں بتایا کہ صابرین کن لوگوں کو کہتے ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَ کَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ قٰتَلَ ..... وَ اللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ

"کتنے ہی انبیاء ایسے گزرے ہیں جن کی معیت میں بہت سے ربانی لوگوں نے حق کے مخالفین سے جنگ کی۔ اس راہ میں انہیں جو تکالیف پیش آئیں ان سے نہ تو ان کے عزائم میں لغزش آئی، نہ ان میں کمزوری پیدا ہوئی اور نہ ہی وہ تھک کر ہمت ہار گئے۔ وہ ان تمام مشکل مراحل میں ثابت قدم اور مستقل مزاج رہے۔ یہی وہ الصابرین ہیں جنہیں اللہ دوست رکھتا ہے۔" (۳:۱۴۶)۔

اسی حقیقت کو ایک دوسرے مقام پر عین میدانِ جنگ کی حالت میں یوں واضح کیا۔

فَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ صَابِرَۃٌ یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ..... وَ اللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (۸:۶۶)

"اگر تم میں سے ایک سو صبر کرنے والے ہوں تو وہ دو سو پر غالب آجائیں گے ..... یقیناً اللہ صابرین کے ساتھ ہے۔"

ان آیات کی روشنی میں واضح اور متعین طور پر سامنے آجاتا ہے کہ قرآنِ کریم میں صبر سے مفہوم کیا ہے اور صابر کسے کہتے ہیں۔ لغوی اعتبار سے بھی اس لفظ کے یہی معانی ہیں جو تصریفِ آیات کی رُو سے سامنے آئے ہیں لیکن صبر کے جو معانی ہمارے ہاں مروّج ہیں ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ انتہائی بیچارگی، بے بسی اور بے کسی کی کیفیت کو ظاہر کرنے کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اس سے قرآن کے مفہوم کو کس طرح واضح کیا جا سکتا ہے؟

تصریفِ آیات کی رُو سے قرآنی اصطلاحات کے مفاہیم بھی واضح طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ لہٰذا کوئی عام

لفظ ہو یا قرآنی اصطلاح، اگر وہ تمام آیات بیک وقت سامنے رکھ لی جائیں جن میں قرآنِ کریم نے انہیں استعمال کیا ہے تو ان الفاظ و اصطلاحات کے معانی متعین کرنے میں ذرہ بھر دشواری نہیں رہتی۔

اور آخری چیز، جو قرآن فہمی کے سلسلے میں انتہائی اہمیت رکھتی ہے، وہ یہ کہ قرآنِ کریم کی پوری تعلیم کا مجموعی تصور سامنے ہونا چاہیئے اور اس بنیادی اصول کو ہمیشہ مدِنظر رکھنا چاہیئے کہ اس کے مفردات اور اصطلاحات کا مفہوم اس کی مجموعی تعلیم کے خلاف نہ جائے۔ اس لئے کہ قرآنِ کریم کا دعوےٰ ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مثلاً قرآن وحدتِ انسانیت کا علمبردار ہے۔ لہٰذا اس کی کوئی تعبیر و تشریح ایسی نہیں ہو سکتی جو انسانوں میں تشتت و افتراق کا باعث ہو۔ انسانی ذات کا استحکام، معاشی خوشحالی، تہذیبی ارتقاء، احترامِ آدمیت، وسعتِ اختیار، آزادی کا تحفظ اور امن و سلامتی کی ضمانت اس کے بلند مقاصد اور اعلیٰ اقدار میں سے ہیں جن کے برعکس کوئی مفہوم متعین نہیں کیا جا سکتا۔

وما علینا الا البلاغ

دے پیرِ حرم رسم و راہِ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا

اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا

تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا

دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

ملک حنیف وجدانی

قرآن اور علم الاعداد

۱۹ کے عدد کا چکر اگر "تسمیہ" کے ۱۹ حروف کی بنیاد بنایا گیا ہے، تو یہ بنیاد بھی بقول عبدالقدوس ہاشمی صاحب متزلزل ہے۔ کیونکہ انہوں نے ان حروف کی تعداد ۲۱ بتائی ہے۔ اگر یہ بنیاد "واحد" کے اعدادِ ابجد ۱۹ کے مطابق رکھی گئی ہے، تو پھر تسمیہ کے اعداد ابجد کو کیوں نظر انداز کیا گیا ہے جو کہ عام روایت کے مطابق ۸۶ ہیں اور انیس پر تقسیم نہیں ہو سکتے۔ مسٹر خلیفہ راشد صاحب دو کشتی نہ لگائیں، ایک بنیاد پر کام کریں۔ اگر یہ بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ ہر انیس سال بعد سورج، زمین اور چاند ایک خطِ مستقیم پر واقع ہوتے ہیں، تو آخر کیا انقلاب آجاتا ہے۔ اگر زمین سورج اور چاند کے درمیان ہو تو چاند گرہن ہوتا ہے۔ اگر چاند، زمین اور سورج کے درمیان ہو تو سورج گرہن ہو جاتا ہے اور بس! کیا ان گرہنوں سے انسان کی تقدیر وابستہ ہے؟ یہ تو وہی عہدِ سحر کے خفتہ فتنوں کو بیدار کرنے والی بات ہوگی۔ آج دنیا بہت آگے نکل چکی ہے۔ ہم تو اس خطِ مستقیم کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتے جس میں سورج، عطارد، زہرہ، زمین، مریخ، مشتری، زحل، یورینس، نیپچون اور پلوٹو آجائیں۔ کیونکہ انسان اس دنیا میں روح، انا، نفس، خودی، انسانی ذات کے ساتھ آیا ہے۔ یہی اختیار و ارادہ اس کے لئے احسنِ تقویم کا نورانی ہار لایا۔ یہی قوت اس کو اکثر مخلوق پر مشرف و فضیلت عطا کرتی ہے۔ یہی قوت قوموں کو غلامی سے نجات دلانے کے لئے آمادہ کرتی اور فی سبیل اللہ شہادت کی بنیاد بنتی ہے۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔ ؎

سُنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے

آج ہمیں ۱۹ کی نہیں ایک کے عدد کی ضرورت ہے۔ ایک اللہ، ایک آخری رسولؐ، ایک قرآن، ایک بیت اللہ اور ایک ملتِ اسلامیہ۔

اہلِ مغرب، امتِ مسلمہ کے مستقبل سے خائف ہیں اور چاہتے ہیں کہ

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے (اقبالؒ)

وہ خود تو کمپوٹر سے دیگر کام لے رہے ہیں اور ہمیں قرآن کے حروف گننے اور ان کی جمع، تفریق، ضرب، تقسیم میں لگا دینا چاہتے ہیں تاکہ کہیں سے کوئی خودی کا شرارہ پھوٹ نہ پڑے۔ یہ کسی طرح متحد نہ ہو جائیں اور ان کی علاقائی حد بندیاں نہ ٹوٹ جائیں۔

آیئے! میں آپ کو علم الاعداد کا ایک نیا درس دیتا ہوں۔

۱۔ روح، نفس اور انا کے تین تین حروف ہیں۔ جبکہ صفاتِ خداوندی میں سے وَلِیٌّ، غَنِیٌّ، قَوِیٌّ، نُوْرٌ، اَوَّلٌ، آخِرٌ، اَحَدٌ اور صَمَدٌ میں بھی تین تین حروف ہیں اور تسمیہ میں اَللّٰہ، رَحْمٰن، رَحِیْم کی گنتی ۳ تک ہی جاتی ہے۔

۲۔ اَللّٰہ میں ۴ حروف ہیں جبکہ علمِ ابجد میں اس کے اعداد ۶۶ ہیں جو کہ ۱۹ پر تقسیم نہیں ہو سکتے۔ گویا اللہ ۱۹ سے بے نیاز ہے۔ محمد اور احمد میں بھی ۴، ۴ حروف ہیں۔ اب آپ وہ صفاتِ خداوندی ملاحظہ فرمائیں جن میں ۴، ۴ کے حروف ہیں اور ان کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

رَحْمٰنٌ	رَحِیْمٌ	مَالِکٌ	مُحِیْطٌ	قَدِیْرٌ	عَلِیْمٌ	حَکِیْمٌ	تَوَّابٌ
بَصِیْرٌ	وَاسِعٌ	بَدِیْعٌ	سَمِیْعٌ	کَافِیٌ	شَاکِرٌ	وَاحِدٌ	غَفُوْرٌ
حَلِیْمٌ	قَابِضٌ	بَاسِطٌ	قَیُّوْمٌ	اَعْلٰی	عَظِیْمٌ	حَمِیْدٌ	وَھَّابٌ
رَقِیْبٌ	حَسِیْبٌ	شَھِیْدٌ	غَافِرٌ	مَقِیْتٌ	وَکِیْلٌ	بَاطِنٌ	قَاھِرٌ
قَادِرٌ	لَطِیْفٌ	خَبِیْرٌ	مُمِیْتٌ	حَفِیْظٌ	قَرِیْبٌ	مُجِیْبٌ	مَجِیْدٌ
وَدُوْدٌ	کَبِیْرٌ	مُتَعَالٌ	مَنَّانٌ	خَلَّاقٌ	صَادِقٌ	وَارِثٌ	بَاعِثٌ
کَرِیْمٌ	مُبِیْنٌ	ھَادِیٌ	فَتَّاحٌ	شَکُوْرٌ	رَزَّاقٌ	قُدُّوْسٌ	سَلَامٌ
مُؤْمِنٌ	عَزِیْزٌ	جَبَّارٌ	خَالِقٌ	بَارِیٌ	مُصَوِّرٌ	مَعِیْدٌ	

اب آپ بتائیں کہ ۱۹ کا عدد اہم ہے یا ۴ کا۔ خدارا سچائی اپنائیں۔ اور بقول اقبالؒ ؎

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

اقبالؒ نے چار عناصر کی نشاندہی فرمائی اور میں چار کے عدد کے مطابق بہت سی صفاتِ خداوندی کو سامنے لایا ہوں۔ آپ معاشرے کے زندہ کردار میں ان صفات کو لائیے اور پھر دیکھئے کہ قرآن کیسا معجزہ ہے۔ اس معجزے سے دنیا میں کیسے ان ہونی بات ہو جاتی ہے۔

بقول علامہ اسلم جیراجپوریؒ ؎

اس اوراقِ نیلگوں میں مجھ آتا ہے نظر
اپنی ملت کا ستارہ نور برساتا ہوا

پھر دنیا میں کس طرح ایک جنتی معاشرہ قائم ہو جاتا ہے جس کے لئے قرآن نازل کیا گیا تھا۔

آیئے اپنی خودی کو بیدار کرنے کا سامان پیدا کریں۔ امریکہ اور اقوامِ متحدہ کی غلامی نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ فلسطین، کشمیر اور بوسنیا میں مظالم کی انتہا ہو گئی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے قادیانیوں کے متعلق لکھا تھا۔

وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

اور مغرب کی مشینوں کے متعلق لکھا تھا۔

احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

کمپیوٹر بھی ایک ایسا ہی آلہ ہے۔ اگر یہ مردِ مومن سے خودی چھین لیتا ہے تو ہمارے کس کام؟ ذرا کمپیوٹر سے روح، نفس، انا والی بات تو کرائیے! علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا۔

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

ہمیں خودی والا مسلمان چاہیئے جو صفاتِ خداوندی کو اپنے اندر پیدا کر کے معاشرے کو طوفانی قوتوں والا اور انقلابی بنا دے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں

میرے حلقۂ سخن میں ابھی زیرِ تربیت ہیں
وہ گدا کہ جانتے ہیں رہ و رسمِ کجکلاہی

ان زیرِ تربیت افراد میں یقیناً علامہ غلام احمد پرویز صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے جنہوں نے ان کے مشورہ پر طلوعِ اسلام کا اجرا کیا اور معارف القرآن جلد اوّل "اللہ" شروع کی جو ۱۹۴۱ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ اسی مردِ قلندر نے قائداعظمؒ کے ساتھ رہ کر انہیں قرآنی حقائق سے آگاہ رکھنے کا فریضہ ادا کیا اور قیامِ پاکستان کے بعد درسِ قرآن، تصانیف اور طلوعِ اسلام کے ذریعے ان بیدار خودی والوں کو قرآن کا آبِ حیات دے کر وراثتِ ارضی کے لئے تیار کرنا شروع کیا۔ یہ جماعت اپنے زورِ دروں سے آگے بڑھ رہی ہے اور کمپیوٹر سے زیادہ کام کرے گی۔ انشاءاللہ۔ اب وہ وقت دُور نہیں جب پاکستان میں قرآنی آئین اور مستقل اقدار کا بول بالا ہو گا۔ عوام جمہوریت، بارس ٹریڈنگ اور "دَوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَا" کا کھیل دیکھ چکے ہیں۔ اب شاید اس کو دہرانے کی مہلت نہ مل سکے اور

بقول اقبالؒ یہ نویدِ جانفزا ہی سننے پر ہر ایک کو مجبور ہونا پڑے کہ ؎

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقرآن زیستن

نوٹ : میں نے صفاتِ خداوندی ۳-۲ اور ۴-۴ میں گروپ بندی (سیٹ) میں لانے کی جسارت اس لئے کی ہے تاکہ ۱۹ کا سحر ٹوٹے اور ہم دوسروں کی خودی نہیں بلکہ اپنی خودی کے بل بوتے پر آگے بڑھیں۔ درج ذیل اسماء ۳-۳ یا ۴-۴ کی ذیل میں نہیں آسکتے۔ اس سے ان کی اہمیت بھی کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ صفاتِ خداوندی کی وحدت اعداد سے نہیں، خصوصیات سے ہے۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۔ حَیٌّ ۔ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۔ نِعْمَ الْمَوْلٰی ۔ نِعْمَ النَّصِیْرُ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ۔ حَیٌّ ۔ قَابِلُ التَّوْبِ ۔ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۔ ذُو الطَّوْلِ ذُو الْقُوَّةِ ۔ مُقْتَدِرٌ ۔ ذُو الْجَلَالِ وَ الْاِکْرَام ۔ مُهَیْمِنٌ۔

حضرت ابوبکرؓ کا خطبۂ خلافت

"اے لوگو! میں تمہارا سربراہ بنایا گیا ہوں لیکن میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں صحیح (نیک) کام کروں تو اس میں میری مدد کرو۔ اگر غلط قدم اٹھاؤں تو مجھے ٹوکو۔ صدق امانت ہے اور کذب خیانت۔ تم میں سے کمزور ترین شخص میرے نزدیک قوی تر ہے جب تک میں اسے اس کا حق نہ دلا دوں، اور تم میں سے قوی تر آدمی میرے نزدیک کمزور تر ہے جب تک میں اس سے وہ حق نہ لے لوں جو اس کے ذمے ہے۔ جو قوم خدا کی راہ میں جہاد ترک کر دیتی ہے اس پر اللہ ذلت اور خواری مسلط کر دیتا ہے اور اگر کسی قوم میں بے حیائی پھیل جاتی ہے تو اللہ اس پر مصائب اور تباہی کا عذاب عام کر دیتا ہے۔ تم میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں لیکن اگر مجھ سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جس سے اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کا پہلو نکلتا ہو تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔"

(شاہکارِ رسالت)

حسین امیر فرہاد

لیلۃ القدر

پرچہ جب تک آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا، رمضان المبارک کا آخری عشرہ شروع ہو چکا ہوگا۔ اس عشرے میں ریڈیو ہو، ٹیلی وژن ہو یا اخبارات، محراب و منبر ہو یا صوفیا کرام کی محافل، ہر جگہ ایک ہی موضوع زیر بحث دکھائی دے گا۔ وہ ہے لیلۃ القدر کی فضیلت اور برکات۔

روائت ہے کہ اس رات کو رمضان المبارک کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔ کچھ علماء یہ بھی فرماتے ہیں کہ سورہ لیلۃ القدر میں لفظ لیلۃ القدر تین مرتبہ آیا ہے اور یہ ۹ حروف کا مجموعہ ہے۔ لہٰذا تین کو نو سے ضرب دی جائے تو ستائیس بنتے ہیں۔ اس لئے قوی امکان ہے کہ لیلۃ القدر رمضان المبارک کی ۲۷ تاریخ ہی کو ہو۔

یہ حساب کتاب بھی عجب شے ہے۔ کسی فلاسفر نے اپنی بیوی سے پوچھا۔ آج کیا پکا ہے۔ بیوی بھنا کر بولی "خاک" پکا ہے۔ کہنے لگے خاک کا الٹ کاخ ہوتا ہے۔ کاخ کو محل بھی کہتے ہیں۔ محل کو الٹا لکھا جائے تو لحم بنتا ہے۔ لحم کو عربی میں گوشت کہتے ہیں۔ لہٰذا میں سمجھ گیا گھر میں آج گوشت پکا ہے۔

اس منطق کو اگر کچھ دیر کے لئے صحیح سمجھ بھی لیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ۲۷ رمضان المبارک کس فرقے اور کس ملک کی؟ صوبہ سرحد میں تین چار عیدیں ہوتی ہیں۔ امریکہ میں رمضان المبارک ایک دن تاخیر سے شروع ہوتا ہے۔ بعض ممالک میں عید ایک روز پہلے ہو جاتی ہے۔ ایسے میں کتنی شب قدریں ہوں گی؟ یہی سوال کسی نے پچھلے دنوں ٹی وی پر ایک مولوی صاحب سے پوچھا تو جواب ملا کہ اللہ کے گھر میں کس چیز کی کمی ہے۔ بعض مصلحت پسند علماء نے اس مشکل کا یہ حل پیش کیا کہ حساب کتاب کی گنجلکوں میں الجھے بغیر لیلۃ القدر کی تلاش میں ۱۸ رمضان المبارک ہی سے شب بیداری شروع کر دی جائے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا تھا ؎

اے شیخ کیا ڈھونڈے ہے شب قدر کا نشان
ہر شب، شب قدر ہے اگر تو ہو قدر دان

دنیا بھر میں مسلمان اس ساعت کی تلاش میں ہیں۔ مگر کسی بھی شخص نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ یہ ساعت اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ کہتے ہیں اس رات ایک لمحے کے لئے ساری دنیا میں روشنی پھیل جاتی ہے اور ہر چیز

سجدہ ریز ہو جاتی ہے۔ ایسے میں جو مُراد بھی مانگی جائے وہ پوری ہو جاتی ہے۔

آیئے دیکھتے ہیں قرآنِ حکیم اس رات کے لئے کیا راہنمائی فراہم کرتا ہے۔

قدر عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں پیمانہ، اندازہ، ماپ تول وغیرہ۔ اُردو میں بھی یہ لفظ انہی معنوں میں مستعمل ہے۔ مثلاً کس قدر چینی درکار ہے، آپ کس قدر وزن اٹھا سکیں گے۔ مقدار اور تقدیر اسی سے مشتق ہیں۔ قدرہ اور مقیاس، گز یا انچی ٹیپ کو کہتے ہیں۔ (LAND SURVEYOR) کو مَسّاحُ الارض کہتے ہیں اور (QUANTITY SURVEYOR) مَسّاحُ الاقدار کہتے ہیں۔ قِدْر، قدرۃ پتیلے کو کہتے ہیں جو آجکل بگڑ کر جِدْر بن گیا ہے۔ لغات القرآن میں بھی اس لفظ کی تفصیل دی گئی ہے۔ مگر میں نے قدر کے وہ معنی دیئے ہیں جو مجھے معلوم ہیں، جن سے میرا واسطہ پڑا ہے۔ ورنہ اندازہ، مقدار، طریقہ اصل اصول، عزت، طاقت، VALUE کا تو ہر شخص کو علم ہے۔

قاموس العصری میں لیل کے لئے لکھا ہے (LONG AND DARK NIGHT)۔ مگر ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم عربی الفاظ کے وہ معنی لیتے ہیں جو ہمارے ہاں مروّج ہوتے ہیں۔ اگر کوئی عرب ہمیں مجنوں کہدے، تو ہمارا تصور لیلےٰ کی جانب چلا جاتا ہے جبکہ مجنوں، پاگل اور سجن المجانین، پاگل خانے کو کہتے ہیں۔ قدر کا لفظ جب ہمارے سامنے آتا ہے تو ذہن میں یہی آتا ہے کہ میں زید کی قدر کرتا ہوں، وہ میری قدر نہیں کرتا۔ لیلۃ القدر کے متعلق قرآنی بیان ہے کہ اس رات قرآنِ پاک نازل ہوا۔ یعنی نزول کی ابتداء ہوئی۔ رات اور اندھیرا لازم و ملزوم ہیں۔ نزولِ قرآن سے قبل اس کائنات پر ایک طویل اور دبیز اندھیروں کی رات چھائی ہوئی تھی۔ دنیا وحی خداوندی کی روشنی سے معدوم ہو چکی تھی۔ حضورؐ بھی سرگرداں تھے۔ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (۹۳/۷)۔ جن کے پاس اللہ کی کتابیں تھیں ـــ یہود و نصاریٰ ـــ ان کی یہ کیفیت ہو چکی تھی کہ وہ جانتے بوجھتے، سوچتے سمجھتے خدا کے کلام میں تحریف کرتے تھے (۲:۷۵)۔ یہود نے اپنے احبار و رہبان کو خدا بنا رکھا تھا (9:31)۔ انسان کی مثال یوں تھی کہ آسمان سے پانی برس رہا ہو اور اس میں اندھیرے پر اندھیرا چھا رہا ہو...... (2:19)۔ یوں سمجھ لیجئے انسانیت اندھیروں میں بھٹک رہی تھی۔ اگر انسان وحی کی اتباع سے محروم ہو جائے تو انسان حیوانی جذبات کے تحت زندگی گذار رہا ہوتا ہے۔ انسانی زندگی شروع ہی وہاں سے ہوتی ہے جہاں سے وحی کی راہنمائی کی ابتدا ہوتی ہے۔

کائنات پر ایک دبیز اندھیری رات چھائی ہوئی تھی۔ انسانیت ٹھوکریں کھا رہی تھی۔ لڑکیوں کو زندہ دفن کیا جا رہا تھا۔ بنی آدم جانوروں کی طرح فروخت ہوا کرتا تھا۔ غلامی کا عام رواج تھا۔ آسمانی کتابیں مسخ ہو چکی تھیں۔ انسان اپنے حقیقی خالق کو بھول چکا تھا۔ بتوں کی پرستش عام تھی۔

ایسے میں پروردگار نے دنیا کو وحی کی روشنی سے منور کیا۔ مہینہ تھا رمضان کا۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ (2/185) وہ رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن کا نزول ہوا۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (44/1) وہ ایک برکت والی رات تھی ــــ قرآن کے نزول کی گھڑی کو رات کہا گیا ہے۔ قرآن کیا ہے۔ "روشنی" فرمایا۔ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (14/1) اس روشنی کے ذریعے تم لوگوں کو تاریکی سے روشنی کی طرف لاؤ۔ تاریکی جس میں کسی چیز کی ماہیت کا پتہ نہیں چلتا۔ رسی بھی سانپ نظر آتی ہے۔ سورۃ القدر کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے یہ قرآن اس وقت نازل کیا جب تمام دنیا وحی کی راہ نمائی سے محروم تھی۔ چاروں طرف دبیز تاریکی تھی۔ میں نے اسے نئی اقدار اور نئے پیمانوں کے ساتھ نازل کیا۔ جس رات اس کا نزول ہوا وہ نئے جہان کی نمود کی رات تھی۔ اللہ کے علاوہ تمہیں اور کون بتائے گا کہ یہ نئی اقدار اور پیمانوں کی شب کتنی عظمت کی شب ہے۔ یہ شب اندھیرے کے دَور کی ہزار ہا راتوں سے بہتر ہے (کیونکہ ان میں دنیا وحی کی روشنی سے محروم تھی)۔ یہ رات پہلی سحر ہے اس دَور کی جو نزولِ قرآن کے بعد آنے والا ہے۔ اس دَور کی خصوصیت یہ ہے کہ رفتہ رفتہ قانونِ خداوندی کے مطابق کائنات کی قوتیں اور وحیٔ خداوندی ہمرنگ ہو جائینگی۔ انسان فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لے گا اور بالآخر یہ دنیا اپنے خالق کے نُور سے جگمگا اٹھے گی۔

قارئین کرام! بات واضح ہو چکی ہوگی کہ یہ رات بابرکت اس لئے ہے کہ اس میں قرآن جیسا ضابطۂ حیات نازل ہوا۔ لہٰذا فضیلت اور فوقیت قرآن کو حاصل ہے۔ قرآنِ پاک کو جو فضیلت اور فوقیت حاصل ہے وہ رات کی وجہ سے نہیں۔ رات کو جو بزرگی حاصل ہے وہ قرآن کی وجہ سے ہے۔ ہم نے اصل چیز قرآن کو تو چھوڑ رکھا ہے اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے اور رات کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ایک، دو، آٹھ، دس نہیں، پوری قوم کی یہی حالت ہے۔ رسولِ اکرمؐ یہ شکوہ کریں گے کہ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (25/30)۔ اے میرے پروردگار میری قوم نے قرآن کو مہجور کیا روگردانی کی چھوڑ دیا اور رات کی تلاش میں لگے رہے۔

اَوَلَمْ یَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰى عَلَیْهِمْ..... (29/51)۔ کیا ان لوگوں کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔ کچھ شک نہیں کہ اس میں مومنوں کے لئے رحمت اور نصیحت ہے اور یہ کتاب، جو ہم نے نازل کی ہے بابرکت ہے (6/93)۔ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ.... (6/156)۔ (اے کفر کرنے والو) یہ کتاب بھی ہمیں نے اتاری ہے، برکت والی ہے۔ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "اور یہ مبارک نصیحت ہے جسے ہم نے نازل فرمایا ہے۔

تو کیا تم اس سے انکار کرتے ہو (21/50)۔ سب سے اہم شے تو ہے قرآنِ کریم جسے ہم نے مخمل میں لپیٹ کر طاقوں پہ سجا رکھا ہے اور رات کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے لختِ جگر کی تاریخِ پیدائش پر سالگرہ منانا نہیں بھولتا۔ مگر بیٹے سے لاپروا ہے۔ بیٹا نشے کا عادی ہے۔ تیرے میرے کے در پہ پڑا رہتا ہے۔ بھیک مانگ کر پیٹ بھرتا ہے۔

کوئی ساس دلہن کو چھوڑ کر ڈولی کو پیار کرنے لگے تو اسے کون صحیح الدماغ سمجھے گا کیونکہ اصلی شے دلہن ہے نہ کہ ڈولی۔

حیرت ہے ان لوگوں پر جو قرآنِ کریم کو چھوڑ کر رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں رت جگا کرتے ہیں اور ایک ایسی چیز کو تلاش کرتے ہیں جس کا وجود ہی نہیں۔ قرآن ہدایت ہے۔ نور ہے۔ شفاء لما فی الصدور ہے۔ ہمیں اس ہدایت کو سمجھ کر اس پر عمل کرنا چاہیئے۔

سوچیئے! آپ اپنی کار میں بیوی بچوں کے ساتھ جا رہے ہیں۔ آگے بورڈ پر کچھ ہدایات لکھی ہیں کہ خبردار آگے پُل شکستہ ہے، متبادل راستہ اختیار کریں۔ آپ ان ہدایات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ انجام ظاہر ہے۔ اس لئے عزیزانِ من! قرآنِ حکیم سے مستفید ہونے کا ایک ہی طریق ہے کہ اسے پڑھا جائے، سمجھا جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔ یہ اس لئے کہ ؎

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

دارُو کوئی سوچ اُن کی پریشاں نظری کا

میں نے قائداعظمؒ کو نزدیک تو کیا' دُور سے بھی نہیں دیکھا اور میری یہ محرومی عمر بھر کی محرومی رہتی اور شاید مجھے اس کا احساس بھی نہ ہوتا اگر مجھے قائد کے ایک ایسے ساتھی سے ملاقات، اور پھر قربت کا شرف حاصل نہ ہو جاتا جسے یہ منفرد اعزاز حاصل تھا کہ وہ ان سے بغیر پیشگی وقت مقرر کئے مل سکتا تھا اور جسے وہ دین کے معاملات میں مشوروں میں بھی شریک کیا کرتے تھے۔ میری مراد جناب غلام احمد پرویزؒ سے ہے۔ انہی سے میں نے دو قومی نظریہ کا مطلب سمجھا' انہی کے افکار سے مجھ پر یہ عیاں ہوا کہ قیامِ پاکستان کیونکر ایک سیاسی مسئلہ ہی نہیں' ہمارے دین کا تقاضا بھی تھا۔ اور انہی کے فرمودات سے مجھ پر قائد کی شخصیت کے ایسے پہلوؤں کی نقاب کشائی ہوئی جو عام لوگوں تک اس لئے نہیں پہنچ پائے کہ مخالفوں کے پراپیگنڈے نے ان پر پردے ڈال کر لوگوں کی نظروں سے چھپا رکھا۔

—— اور آج میں خود کو خوش بختوں میں شمار کرتا ہوں کہ میں ان لوگوں کے درمیان ہوں جنہیں اس صدی کے عظیم ترین شخص کا قرب میسّر تھا جنہوں نے اسے خلوت و جلوت میں دیکھا اور اس کی عظمت کے گواہ ہوئے۔

سُنا ہے ایک بار شورش کاشمیری نے مولانا ابوالکلام سے (ان کی مدح سرائی کے بعد) درخواست کی 'مولانا مجھے قریب رہنے کا موقع دیجئے میں آپ جیسی عظیم ہستی سے فیض حاصل کرنا چاہتا ہوں —— تو مولانا نے جواب دیا تھا'' عزیزم، قریب آنے سے عظمتوں کے تاج محل اکثر مسمار ہو جایا کرتے ہیں''۔ ہاں قربت کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کرتا ہے' مگر جہاں کردار بے داغ اور شفاف ہو وہاں اپنی زندگی کو بطور گواہ بھی پیش کیا جاتا ہے

فقد لبست فیکم عمرًا من قبلك

کے الفاظ' اس ذاتِ گرامی سے' جو بلاشبہ کائنات کی عظیم ترین ہستی تھی خالقِ کائنات نے کہلوائے جب ان سے کسی معجزے کی فرمائش کی گئی تھی ——

یہ حضرات قائداعظم کے کردار کی بلندی اور بطور ایک اصول پرست سیاستدان ان کی عظمت کے گواہ ہیں' آج کی اس محفل میں' میں بھی آپ کے ساتھ ان کے خیالات سے مستفید ہونگا۔

میں نے تو صرف کتابوں میں پڑھا ہے' انہوں نے آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سُنا ہے اور آج جو اندازِ

سیاست ہے اس کو پیشِ نظر رکھیں تو قائد کی باتیں افسانہ نظر آتی ہیں بلکہ الف لیلوی قصے۔

مسٹر اصفہانی اپنی کتاب M. A. JINNAH AS I KNEW HIM میں ۱۹۴۶ء کے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں جب کلکتہ چیمبر آف کامرس کی ایک خیالی نشست کے لئے مسٹر اصفہانی بطور مسلم لیگی امیدوار کھڑے ہوئے انتخاب بلامقابلہ متوقع تھا مگر آخری وقت یہ بالکل خلافِ توقع ایک اور صاحب نے اپنے کاغذاتِ نامزدگی داخل کرا دیئے ایک شام عبدالرحمٰن صدیقی بھاگے بھاگے آئے اور اصفہانی کو یہ مژدہ سنایا کہ انہوں نے فریقِ مخالف کو اس پر رضامند کر لیا ہے کہ اگر ہم اس کے زرضمانت کا مبلغ ۲۵۰ روپیہ ادا کر دیں، تو وہ مقابلہ سے دستبردار ہو جائے گا۔ قائداعظمؒ کے کان میں بھنک سی پڑی تو انہوں نے صدیقی سے کہا۔ ذرا اپنی بات کو دہرائیں۔ انہوں نے بات سنائی تو قائداعظمؒ نے سخت برافروختہ ہو کر کہا۔ "تم نے کیا کہا' پیسے دے کر فریقِ مخالف کو ہٹا دینا' یہ بالواسطہ رشوت نہیں تو اور کیا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا' جاؤ' اس سے کہو کہ ہمیں منظور نہیں' ہم اس کا مقابلہ کریں گے۔"

انہوں نے مسٹر اصفہانی سے کہا۔ "میرے عزیز یاد رکھو پبلک زندگی میں اخلاقی دیانت پرائیویٹ زندگی سے بھی زیادہ اہم ہے' پبلک زندگی میں بددیانتی سے لاتعداد لوگ مجروح ہوتے ہیں اور اس سے ہزارہا لوگ بے راہ رو ہو جاتے ہیں جن کا آپ پر اعتماد ہوتا ہے۔"

مسٹر اصفہانی لکھتے ہیں کہ قائداعظم کہا کرتے تھے کہ جو لوگ میری دیانتداری کی تعریف کرتے ہیں وہ کسی طور پر بھی میری عزت افزائی نہیں کرتے' دیانتدار ہونا انسانیت کا تقاضا ہے اور انسانی تقاضے کو پورا کرنے پر تعریف کیسی ـــــ یعنی بالفاظِ دیگر' جو دیانتدار نہیں وہ انسان ہی نہیں۔

میں نے انہیں اس صدی کا عظیم ترین انسان یونہی نہیں کہہ دیا بلاشبہ اس صدی میں بہت بڑے بڑے لوگ سامنے آئے' بڑے بڑے مدبر' بڑے بڑے سیاستدان' جرنیل' وہ لوگ جنہوں نے ملک فتح کئے' وہ لوگ جو بڑے بڑے فاتحین کے سامنے ڈٹے رہے' وہ لوگ جنہوں نے شکست فتح میں بدل دی' جنہوں نے ہاری ہوئی قوم کو فاتحین پہ حاوی کر دیا' وہ لوگ جو اپنے مؤقف' اپنے ادرش کے لئے سالوں پابندِ سلاسل رہے۔

بلاشبہ یہ سب بڑے آدمی تھے مگر چشمِ فلک نے ایسا کارنامہ نہیں دیکھا کہ جسمانی طور پر ایک نحیف و نزار شخص' بغیر کسی لشکرِ جرار کے' بغیر ساز و سامان کے محض اپنی فہم و فراست کو آسا عزم و ہمت سے ایک پسماندہ قوم کو دنیا کی دو بڑی ہی ہوشیار قوتوں ـــــ ہندو سرمایہ دار اور برطانوی استعمار کے مدمقابل کھڑا کر دے اور ان کی تمام چالوں کے علی الرغم ایک خطۂ زمین کا وارث بنا دے۔

دنیا کے نقشے پہ ایک نئے' ایک عظیم اور منفرد حیثیت کے حامل ملک کا وجود ایک ایسا واقعہ ہے جو کسی اور کے حصے میں نہیں آیا ـــــ

میں نے اس ملک کو منفرد حیثیت کا مالک بلا وجہ نہیں کہا۔

یہ قومیت کا ایک نیا تصور لئے نئی قسم کی مملکت تھی جسے قائد نے اس برصغیر کے نقشے پہ ابھارا تھا، یہ نسل، رنگ، زبان کے اشتراک سے نہیں، ایمان کے اشتراک سے معرضِ وجود میں آنے والی ایک قوم تھی ـــــ اسلام صدیوں پہلے ایک ایسی ہی قوم عرب میں معرضِ وجود میں لا چکا تھا جس میں قریشِ عرب کے سردار مدینے کے زراعت کار ہی نہیں حبش کے بلال، روم کے صہیب اور فارس کے سلمان شانہ بشانہ برابر کے شریک اور بھائی تھے۔ یہ وہ قوم تھی جس کی تشکیل اور ترمیل خود حضور نبی کریم صلعم نے کی تھی۔

کچھ عرصہ یہ قوم اسی طرح رہی اور تاریخ گواہ ہے کہ جتنی دیر وہ اس طرح رہی دنیا میں سرفراز رہی، اقوامِ عالم میں سربلند رہی ـــــ پھر یہ عصبیتوں کا شکار ہو کر بٹ گئی، جغرافیائی حدوں میں محبوس ہو کر شامی، مصری، عراقی، ایرانی کہلانے لگی۔

صدیوں بعد، ہمارے برصغیر سے اس صدی کے اوائل میں ایک آواز اٹھی ـــــ بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل، اس نے وطنی قومیت کو بُت قرار دے کر اسے کہا ؎

اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

کیونکہ بقول اس کے، ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے، جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے۔

اس نے یاد دلایا کہ

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

سیاستِ دوراں کو سمجھنے والی اس دُور بیں نگاہ نے جب بھانپ لیا کہ فرنگ رہ گزر سیلِ بے پناہ میں ہے اور مجبوراً اس برصغیر سے رخصت ہونے والا ہے تو اس نے یہاں کے مسلمانوں کو ایک نئی مملکت کا سراغ دیا، اس کی راہ سمجھائی، ایک ایسا خطۂ زمین جس کا پہلے کوئی نام نہ تھا ـــــ یہاں اس نے پھر سے اسلام کو اس کے اصلی اور منزّہ شکل میں نافذ کرنے کے لئے ایک مملکت کا خواب دیکھا، قافلہ سالار کے لئے اس کی دور بین نگاہ نے محمد علی جناح کا انتخاب کیا، جو اس وقت ملکی سیاست لاتعلق انگلستان میں تھے، انہیں CONVINCE کیا، آمادہ کیا کہ وہ واپس آئیں، اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"میری نگاہوں میں اس وقت ہندوستان بھر میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جس کے ساتھ ملتِ اسلامیہ کو اپنی یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اس طوفان میں جو یہاں آنے والا ہے اس کی کشتی کو ثابت و سالم بہ امن و عافیت ساحلِ مراد تک لے جائیں گے۔"

آج قائد کے پاکستان میں قائد کے متعلق طرح طرح کے وسوسے پھیلائے جا رہے ہیں اور قسم قسم کے الزامات تراشے جا رہے ہیں۔

انگریزی لباس اور مغربی تعلیم کو طعنہ بنا کر انہیں اسلام سے بے بہرہ کہا جاتا رہا، ہندوستان کو کمزور کرنے کے لئے انگریز کا مہرہ کہا جاتا رہا ـــــ ان اعتراضات کے رد کے لئے قائداعظم کی کچھ تقریروں کا حوالہ بے جا نہ ہوگا۔

سندھ مسلم لیگ کی سالانہ کانفرنس اکتوبر ۳۸ء میں قائداعظم نے فرمایا:

"برطانیہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھیڑیوں کے حوالے کرنا چاہتا ہے .... ہم ہندو اور برطانیہ دونوں سے لڑیں گے۔"

فروری ۴۰ء لیگ کونسل کے اجلاس میں کہا:

"برطانیہ عظمیٰ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتا ہے، مسٹر گاندھی اور کانگریس مسلمانوں پر حکومت کرنا چاہتے ہیں، ہم کہتے ہیں کہ ہم نہ تو برطانیہ کو مسلمانوں پر حکومت کرنے دیں گے نہ ہندو کو، ہم آزاد رہنا چاہتے ہیں۔"

۱۹۴۲ء، یومِ پاکستان کی تقریب پر

"اگر ہندو قیادت یا برطانیہ الگ الگ یا دونوں متحد ہو کر ہمارے خلاف فریب کاریوں اور سازشوں پر اتر آئیں تو ہم اس کی مدافعت کریں گے۔"

۱۹۴۵ء، پشاور کے جلسۂ عام میں

"ہمارا کوئی دوست نہیں، ہمیں نہ انگریز پہ بھروسہ ہے نہ ہندو پر، ہم دونوں کے خلاف جنگ جاری رکھیں گے خواہ وہ آپس میں متحد بھی کیوں نہ ہو جائیں۔"

ـــــ اور دنیا نے دیکھا کہ یہ متحد ہوئے، برطانیہ دشمنی اور قوم پرستی کی دعویدار کانگریس اور ماؤنٹ بیٹن کی ملی بھگت سے جو نقصان باؤنڈری کمیشن، اساسوں کی تقسیم اور دوسرے معاملوں میں پہنچا وہ ڈھکی چھپی بات نہیں۔

یہ پراپیگنڈا ان لوگوں کا شروع کردہ ہے جنہوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی میں کہا تھا "ہماری خدمات کا یہ صلہ دیا جا رہا تھا، ہمیں بھیڑیوں کے حوالے کیا جا رہا ہے۔" غور کیجئے یہ ایک مسلمان خدائی خدمت گار کا اپنے مسلمان بھائیوں کے متعلق اظہارِ خیال ہے ـــــ ہندو کے ساتھ مل کر ایک قوم کی طرح رہنے پہ مطمئن ہی نہیں بلکہ مصر لوگ اپنے جیسے دوسرے کلمہ گو مسلمانوں کے ساتھ مل کر رہنے کی بجائے نسلی قومیت کی بنا پر علیحدگی کے لئے ریفرنڈم کے طلب گار تھے۔

اور اب دو قومی نظریے کو ایک وکیلانہ حربہ قرار دیا جا رہا ہے اور قائداعظم کو سیکولر حکومت کا حامی کہا

جارہا ہے۔

پہلے تو یہ دیکھئے کہ قائد کا اسلامی حکومت کا تصوّر کیا تھا [یقیناً وہ ایسی ہی حکومت پاکستان میں دیکھنا چاہتے تھے]۔ اس کے لئے ان کا ایک ہی بیان کافی ہے اور اسی سے واضح ہو جائے گا کہ مخالفت میں کمر بستہ، بزعمِ خود مذہبی رہنماؤں کا مطمحِ نظر، یہ مغربی تعلیم یافتہ، دین کی، اسلامی نظام کی اصل و بنیاد پہ کتنی گہری نظر رکھتا تھا۔ ۱۹۴۱ء میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دیں طلباء کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا۔

"اسلامی حکومت کے تصوّر کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی، قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے لفظوں میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے ـــــ اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔"

کیا اس کے بعد کچھ اور کہنے کو باقی رہ جاتا ہے؟ اس مختصر سے بیان میں قیامِ پاکستان کی وجہ جواز اور یہاں رائج کئے جانے والے نظام کی اصل و حقیقت بھی آگئی اور اسی میں اربابٌ من دون اللہ اور سیکولریوں کی مخالفتوں کی وجہ بھی۔

مولانا حضرات تھیاکریسی چاہتے تھے اور قائد نے واضح اور دو ٹوک لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ پاکستان میں تھیاکریسی نہیں ہوگی۔

تھیاکریسی اور سیکولرزم ایک انگریزی EXPRESSION کے مطابق STRANGE BEDFELLOWS ہیں، سیکولرازم بھی یہی کہتا ہے کہ حکومت اور مذہب کا آپس میں تعلق نہیں، قوم کے نمائندے مل بیٹھ کر قوم کے لئے قانون بنائیں، ہاں مذہبی امور، رسوم و عبادات، نکاح، طلاق وغیرہ مذہبی پیشوائیت کے سپرد کر دئے جائیں ـــــ اور یہی تھیاکریسی کا مقصود بھی ہے، وہ بھی دنیاوی معاملات میں بے جا دخل اندازی کی حامی نہیں جب تک شخصی قوانین مثل نکاح، طلاق، رسوم، عبادات میں ان کی اجارہ داری میں دخل نہ دیا جائے۔ اور اب تو ایک قدم آگے ان کو خوش کرنے کے لئے آئینِ پاکستان میں درج کر دیا گیا ہے کہ ان معاملات کو وہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق معنی پہنا سکتے ہیں۔

کہیئے اور سیکولرازم کیا ہوتا ہے، ہماری دانست میں تو سیکولرازم یہی ثنویت، زندگی کو دو الگ الگ حصّوں میں تقسیم کا ہی نام ہے ـــــ قیصر کا حصّہ قیصر کو اور پوپ کا پوپ کو۔

سیکولرازم کے حامی تو قائد کے مخالف ہیں، جبکہ قائد قرآن میں دی گئی حدود کے اندر زندگی کو ایک وحدت مان کر، اس کے تمام تر شعبوں میں قوانین وضع کرنے کے حامی ہیں ـــــ

اسلامی نظام میں ان کا غیر متزلزل یقین آخری دم تک قائم رہا، اپنی زندگی کے آخری پبلک فنکشن سٹیٹ بنک آف پاکستان کا افتتاح کرتے ہوئے انہوں نے جولائی ۴۸ء میں فرمایا:

"ہمارے پیشِ نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوشحالی اور اطمینان کی زندگی بسر کریں، اس مقصد کا حصول مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے نہیں ہو سکے گا، ہمیں اپنا رستہ آپ متعین کرنا چاہیئے اور دنیا کے سامنے ایک ایسا نظام پیش کرنا چاہیئے جو اسلامی مساوات اور عدل عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو، صرف یہی طریق ہے جس سے ہم اس فریضہ سے عہدہ برا ہو سکیں گے جو ہم پر مسلمانوں کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے اور ہم دنیا کو وہ پیغام دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچالے اور نوعِ انسان کی بہبود و مسرت اور خوشحالی کا ضامن ہو سکے، یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہو سکتا۔"

غور فرمایئے وہ نئی مملکت کی خوشحالی، اس اسلامی اقتصادی نظام کے اندر مضمر سمجھتے ہیں اور انہیں اس اس نظام پر اس قدر اعتماد ہے کہ وہ اسے تمام نوعِ انسان کی بہبود و مسرت اور خوشحالی کا ضامن سمجھتے ہیں۔

— اور آج جب کمیونزم کا ہاؤس آف کارڈز بکھر چکا ہے اور مغربی استعمار اپنی تمام تر سائنسی ترقی اور اور استحصال کے باوجود کرۂ ارض کے مسائل حل کرنے کے قابل تو ایک طرف خود اپنے مسائل کا حل ڈھونڈنے میں معذور و بے بس نظر آتا ہے اور محض دھاندلی کے بل پر اپنی مرضی کا نیا عالمی نظام دوسروں پر مسلط کرنے پہ تلا نظر آتا ہے، انسان پہلے سے بھی زیادہ بے چین ہے اور ربّ العزت کے حضور فریاد کناں ہے۔

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات

لیکن اگر متبادل نظام سامنے نہ ہو تو کیا ہوگا، نراج، CHAOS، تباہی۔

اگر اس وقت اس امّت کے قرآن پاک سے روشنی حاصل کرنے والوں نے صحیح سمت رہنمائی نہ کی، تو انسان کے تمام تر دکھوں کی ذمّہ داری ان کے کندھوں پر ہوگی، مسلمان دانشوروں، ماہرین سیاست و معاشیات کا یہی فریضہ ہے جس کی جانب قائدِ اعظمؒ نے اشارہ کیا تھا۔

اے کاش، قائدِ اعظم کچھ عرصہ اور زندہ رہتے، اے کاش، پاکستان ایک حقیقی اسلامی مملکت کی صورت میں وہ مینارۂ نور ہوتی جس کی طرف SHIP WRECKED انسانیت کھنچی چلی آتی۔ اے کاش

یک حرفِ کاشکے ست کہ صد جا نوشتہ ایم

نئی نسل کا کوئی (میں گمراہ نہیں کہتا) ناواقف نوجوان اگر موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے پاکستان کی وجہِ جواز کو

تسلیم کرتا ہے تو وہ قابلِ معافی ہے ـــــ VERDICT OF INDIA کے مصنف بیورلی نکلسن کے بقول اگر پاکستان کی نئی نسل کے دل میں پاکستان کی محبت کم ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جناح سے واقف نہیں۔ وہ کیوں اس سے واقف نہیں، کس نے اپنے فرائض میں کوتاہی کی، کون اس کا ذمہ دار ہے، ہم پرانی نسل کے لوگوں کو اپنے گریبان میں جھانکنا چاہیئے ـــــ!

وحید مراد ۔ کراچی

مغربی ثقافتی یلغار

——— کا مقابلہ کیسے کیا جائے؟؟

طویل دورِ غلامی میں اختیار و ارادہ سلب ہو جانے سے کسی قوم کی نہ صرف تخلیقی صلاحیتیں دب جاتی ہیں۔ بلکہ پوری قوم کی نفسیات (PSYCHE) پر ایجابی پہلو غالب آجاتا ہے۔ چونکہ محکوم قوم کو حاکم قوم کی ہر ادا میں شانِ محبوبیت نظر آتی ہے اس حاکم قوم کی ظاہری تقلید اور نقالی میں ہی فخر محسوس کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طویل دورِ غلامی میں ہم انگریزوں کی تہذیب و ثقافت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ آزادی کے بعد بھی ان کی ظاہری بود و باش اور رہن سہن کی نقالی ہی ہمارے لئے برتری کے احساس کا ذریعہ ہے ——— مغربی (سیکولر) تہذیب نے جہاں صنعت و حرفت سے مادی ترقی کی ہے وہاں انسانیت کو تباہی کے دہانے پر بھی لا کھڑا کیا ہے ——— ہماری بدقسمتی یہ رہی ہے کہ ہم نے اس تہذیب کی صنعتی ترقی پر توجہ نہیں دی مگر اس تہذیب کی ظواہر پرستی سے اس کے نقصانات کا پھندہ ضرور گلے میں ڈالا ہے ——— متاثرینِ مغرب میں سے ہمارے ہاں دو بڑے گروہ پائے جاتے ہیں ایک وہ جو حاکموں کی ہر ادا کی تقلید کو ہی مقصودِ زندگی سمجھتے ہیں اور دوسرے وہ جو اس تہذیب و ثقافت کی ہر سرگرمی کو ناجائز اور حرام سمجھتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ خود ایسی سرگرمیوں میں بالواسطہ یا بلاواسطہ طور سے ملوث ہیں۔ اس ثقافتی تضاد کے نتیجے میں ایک تو ہمارا قومی و ملی تشخص تشکیل نہیں ہو سکا۔ دوسرا ہمارے فکر و نظر اور رویۂ زندگی میں اختلاف و تضاد نے راہ پائی جس کے سبب اس معاشرہ کو تشتت و افتراق گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔ یہ صورتحال انتہائی مہلک اور دور رس نتائج کی حامل ہے اور ہماری سلامتی و بقا اور آزادی و وقار کے لئے بہت خطرناک ہے ——— ہمارے متنازع و حل طلب ثقافتی مسائل میں سے ثقافتی ایجادات و اختراعات کا مسئلہ فوری اور اہم نوعیت کا ہے۔

ریڈیو، ٹی وی اور وی سی آر کی ایجادات ایک عرصہ سے مذکورہ بالا گروہوں میں نزاع کا باعث رہیں۔ پہلے طبقے کے خیال میں اس کے علاوہ ہمارے پاس کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم مغربی صنعتی تہذیب اور ایجادات کو اپنی ضرورت اور تہذیب کا حصہ بنا لیں تاکہ ہر میدان (مثلاً تعلیم اور نشر و اشاعت) میں ان سے بھرپور

فائدہ اٹھایا جا سکے (یہ الگ بات ہے کہ ان ذرائع کو مذکورہ مقاصد کے لئے استعمال نہیں کیا گیا)۔ لیکن دوسرے گروہ میں ایک زیادہ انتہا پسند حلقہ ان اشیاء کو گھر میں لانا اور رکھنا ہی ناجائز اور حرام قرار دیتا ہے جبکہ ذرا معتدل حلقہ ان ذرائع سے اذان، تلاوت، نعتیں اور قوالیاں سننا، ثقافتی سرگرمیوں میں عید، بقرعید، شبِ قدر اور محرم کے تہواروں کی جھلکیاں اور اسلامی تاریخی فلمیں اور ڈرامے دیکھنا جائز قرار دیتا ہے ـــــ لیکن اب ڈش انٹینا کی بے پناہ مقبولیت نے اس ثقافتی تضاد کو مزید گہرا کر دیا ہے جہاں ایک طبقہ میں اس کو اس قدر پذیرائی ملی کہ ٹین کی چھتوں پر بھی یہ نصب نظر آتا ہے وہاں دوسری طرف اس کو بھارتی اور مغربی ثقافتی یلغار کا نام دیا جا رہا ہے اور اس سے بچ کر رہنے کو دینی اور مذہبی فریضہ سمجھا جا رہا ہے۔ ان کے خیال میں بھارت اور مغربی دنیا اس طرح پاکستان کی نسل کو فحش فلموں اور گانوں کے ذریعے بے راہ روی کی طرف لے جانے اور ہماری اسلامی ثقافت کو آلودہ کرنے پر تُل گئی ہے۔ اس لئے اس کے سدِباب کا جو طریقہ بتایا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ حکومت فوری طور پر اس پر پابندی لگا دے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ڈش انٹینا پر پابندی لگانے سے ہم ان برائیوں سے اپنی نسل کو بچا سکیں گے اور کیا ہماری تہذیب و ثقافت اسلامی کہلانے کی مستحق ہے جس کی حفاظت کرنا ضروری ہے۔ ان سوالات کے جوابات دینے سے پہلے یہ متعین کر لینا ضروری ہے کہ تہذیب و ثقافت کیا ہوتی ہے اور پاکستان میں کسی قومی و ملی و اسلامی ثقافت کا وجود ہے بھی کہ نہیں؟ اور مغربی تہذیب و ثقافت میں وہ کونسی برائیاں ہیں جن سے بچنا ضروری ہے اور ان سے بچنے کا طریقہ کیا ہے؟

ثقافت کسی قوم کے عقائد و نظریاتِ زندگی، جمالیاتی ذوق، حسن اخلاق و معاشرت، نظامِ تعلیم و تربیت، فنون و ادبیات اور قومی و ملی روایات سے عبارت ہوتی ہے لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ پاکستان میں کسی قومی یا ملی ثقافت کا وجود ہی نہیں (جسے بیرونی ثقافتی یلغار سے بچایا جائے) کیونکہ نہ ہمارے اندر شعورِ قومیت ہے نہ ثقافتی تشخص، نہ احساس دستور ہے اور نہ وحدتِ ثقافت۔ ہاں علاقائی ثقافتیں، البتہ ضرور موجود ہیں جو قیامِ پاکستان سے ہزاروں سال پہلے سے رائج ہیں ـــــ ہمارے ہاں وہ طبقہ جو علاقائی ثقافتوں کی ترویج کا خواہاں ہے صوبائی خود مختاری کا حامی ہے اور وہ طبقہ جو مغربی نظریہ قوم (نیشنلزم) کا حامی ہے ان کے خیال میں پاکستانی ایک قوم ہیں لہٰذا ان کی ثقافت بھی ایک ہی ہونی چاہیئے۔ یہ مضبوط مرکز کے حامی ہیں۔ ان دو طبقوں کی نزاع کے باعث ہم آدھے ملک سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔ ایک اور طبقہ کے خیال میں پاکستان چونکہ اسلام کے نام پر وجود میں آیا تھا اس لئے ہماری ثقافت بھی اسلامی ہونی چاہیئے۔ انہوں نے اس کو اسلامی بنانے کے لئے کچھ علامتیں بھی وضع کی ہیں۔ مثلاً زبان میں اردو و عربی، شاعری میں نعتیں، موسیقی میں قوالیاں اور عارفانہ کلام، ناولوں میں اسلامی تاریخی ناول، فنِ تعمیر میں مغلیہ طرز کے گنبد و محراب، لباس میں شیروانی اور شلوار قمیض ـــــ

لیکن اسلامی تہذیب وثقافت سے مراد اگر مذہبی عقائد اور رسوم ہوتے تو پاکستان کیا، دنیا کے ہر ملک میں اسلامی تہذیب وثقافت موجود ہے۔ ہر ملک کا مسلمان خدا کو مانتا ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کو مذہبی فریضہ سمجھتا ہے۔ عید، بقرعید کے تہوار مناتا ہے۔ شب قدر پر چراغاں کرتا ہے۔ ختنہ، بسم اللہ، اور نکاح کی رسمیں ادا کرتا ہے اور ان رسوم ورواج کو تو کسی دوسری ثقافت سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا ــــ دراصل اسلامی تہذیب وثقافت صرف رسوم ورواج کا نام نہیں بلکہ اس کی بنیاد قرآنی ضابطۂ حیات ہے۔ لیکن اس کی وضاحت سے پہلے ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ سیکولر (مغربی) تہذیب وثقافت کیا ہے اور اس میں وہ کونسی برائیاں ہیں جن سے بچنا ضروری ہے۔

مادی (سیکولر) نظریہ حیات کی رُو سے تہذیب وثقافت کے چار عناصر ترکیبی ہیں۔ طبعی حالات، آلات و اوزار، نظامِ فکر واحساس اور سماجی اقدار۔ طبعی حالات سے مراد تہذیب کا جغرافیہ ہے۔ یعنی اس کا خارجی ماحول اور یہ خارجی ماحول طرزِ عمل، ذریعہ معاش، رہن سہن غرضیکہ ہر پہلو پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔

سیکولر نظریہ حیات کے مطابق آلات پیداوار کسی تہذیب کا بنیادی جزو ہوتے ہیں کیونکہ انسانی تہذیب کی ترقی آلات واوزار کی ترقی پر ہی منحصر ہوتی ہے۔ جس قسم کے آلات واوزار ہوں گے تہذیب بھی اسی قسم کی ہوگی۔ اس لئے دانایانِ مغرب نے تہذیب کے مختلف ارتقائی ادوار، آلات واوزار ہی کی مناسبت سے مقرر کئے ہیں۔ مثلاً پتھر کی تہذیب، کانسی کے زمانے کی تہذیب، لوہے کے زمانے کی تہذیب وغیرہ۔

ہر تہذیب کا مخصوص نظامِ فکر واحساس ہوتا ہے۔ یہ نظام اس رشتے کی نوعیت کو ظاہر کرتا ہے جو معاشرے کے افراد اور موجودات میں استوار ہوتا ہے۔ چنانچہ سیکولر نظریہ حیات کے مطابق انسان کے حالاتِ وجود جس سطح پر ہوں گے اس کے شعور کی سطح بھی وہی ہوگی۔ جمادات، نباتات، حیوانات اور دوسرے انسانوں سے اس کا رابطہ جس قسم کا ہوگا اس کے سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز اور اس کے عقائد ورجحانات بھی اسی کے مطابق ہوں گے۔

کسی معاشرے میں روابط وسلوک، اخلاق وعادات، طرز بود وباش، رسم ورواج اور فن واظہار کے جو معیار رائج ہوتے ہیں وہی اس معاشرے کی سماجی اقدار کہلاتی ہیں۔ سیکولر نظریہ حیات کے مطابق یہ چاروں قدریں اوپر سے نافذ نہیں ہوتیں بلکہ معاشرہ میں رفتہ رفتہ تشکیل پاتی ہیں۔ سماجی قدریں جامد اور ناقابلِ تغیر نہیں ہوتیں بلکہ ان میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یعنی آلاتِ پیداوار کی ترقی سے سماجی شعور ترقی کرتا ہے اور سماجی شعور کی ترقی سے سماجی اقدار بھی ترقی کرتی جاتی ہیں۔ یعنی کسی خارجی رہنمائی کی ضرورت نہیں، عقل اور تجربہ کی روشنی میں ایسے قواعد وضوابط اور اقدار مرتب کی جاسکتی ہیں جن کے مطابق قوم کی پرورش ہوتی رہے اور اس کے مفاد محفوظ رہیں۔ یعنی اس کے سامنے ایک ہی معیار ہے کہ اجتماعی قوت وسطوت برقرار رہے لیکن جب کبھی نئی صورت حال

درپیش آتی ہے تو سب قوانین و اقدار تبدیل ہو جاتی ہیں (کیونکہ انسانی عقل اور تجربہ بہرحال محدود ہیں، وہ کسی پیش آنے والی صورت حال کے بارے میں پہلے سے اصول وضوابط کا تعین نہیں کر سکتے۔ یعنی انسانی علم چونکہ عالمگیر (UNIVERSAL) نہیں ہے اس لئے اس سے ترتیب دی گئی اقدار بھی ابدی اور مستقل نہیں ہو سکتیں۔) یہی وجہ ہے کہ سیکولر تہذیب کوئی ایسا نظریہ حیات مرتب نہ کر سکی جس کے حوالے سے انسان اس کائنات کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرتے ہوئے اپنی زندگی کا مفہوم اور نصب العین طے کر سکے۔ ہر تہذیب نوعِ انسان کی عالمگیر برادری کے تصور کی بجائے قومیت کے تنگ دائروں میں گھری ہوئی ہے اور ان دائروں میں مسلسل تصادم کا موجود رہنا ناگزیر ہے۔ اس تہذیب کے پاس کوئی ایسے غیر متبدل اصول نہیں جن پر ہر حالت میں عمل پیرا رہنا اہلِ مغرب کا ایمان ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان اقوام کے فیصلے ان کی مصلحتوں کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔

زندگی کے مطلق مقصد کا تعین اور غیر متبدل اصولوں کے لئے خالق کائنات اور اس کی صفات (مستقل اقدار) پر ایمان اور ان مستقل اقدار کو حدِ بشریت میں متشکل کرنے اور ان کے مثبت نتائج حاصل ہونے پر ایمان ضروری ہے۔ اگر یہ ایمان نہ ہو تو پھر زندگی اور کائنات کا کوئی مطلق مفہوم باقی نہیں رہتا اور یہ سب کچھ محض اضافی معاملہ رہ جاتا ہے۔ یہ وہ نفسیاتی صورتحال ہے جس نے سیکولر تہذیب میں بے معنویت کے احساس کو جنم دیا۔ اس احساس نے انسانی روح میں ایک گہری تشویش، کائناتی تنہائی کا شل کرنے والا کرب اور بے معنویت سے پیدا ہونے والا اضطراب پیدا کر دیا۔

اس تہذیب نے جس انسان کو جنم دیا ہے وہ محض صارف ہے۔ اس کی سب سے بڑی خواہش زیادہ سے زیادہ چیزوں کو حاصل کرنا، انہیں استعمال کرنا اور پھینک دینا ہے۔ اپنی اس خواہش سے مغلوب ہو کر اس نے فطرت کے نظام ہی کو فنا کر دیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ وسائل کی آرزو میں وہ ساری دنیا پر اپنا تسلط قائم کرنے کے درپے ہے۔ وہ حریص، مضطرب اور جارح ہے۔ اسے زندگی اور وجود کی گہرائیوں سے کوئی لگاؤ نہیں۔ قرآن اس سطح زندگی کو حیوانی زندگی قرار دیتا ہے اور جو لوگ زندگی کی بلند حقیقت سے انکار کرتے ہیں وہ حیوانوں کی طرح متاعِ حیات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

قرآن حیوان اور انسان میں جو فرق بتاتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کو مادی جسم کے علاوہ ذات (اختیار وارادہ اور فیصلہ کی قوت) بھی عطا کی گئی ہے اور اس کی نشوونما صرف مستقل اقدار پر عمل پیرا ہونے سے ہو سکتی ہے۔ چونکہ قرآنی ضابطہ حیات کا مقصد انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ اس لئے اسلامی تہذیب کی بنیاد مستقل اقدار اور قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہ ہونے سے جو قوم اتنی قوت فراہم کر لیتی ہے کہ اسے دوسری قوموں کی مخالفت کی پرواہ نہ رہے، وہ بلا تامل سب کچھ کرتی چلی جاتی ہے۔ دوسرا سیکولر نظریہ حیات میں ثقافت اس محدود

طبقے کی ثقافت ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں سیاسی واقتصادی قوت ہو لیکن اسلامی تہذیب وثقافت کسی مخصوص طبقے کی ثقافت نہیں، پوری انسانیت کی ثقافت ہے۔ اس میں حاکمیت صرف اللہ کی ذات کو حاصل ہے انسانوں کا کام حد بشریت میں خدائی صفات (مستقل اقدار) کو متشکل کرنا ہے۔ ان اقدار میں احترامِ آدمیت، مدارج بہ اعتبار عمل، ربوبیتِ عالمینی، عدل، ناروائی ظلم، قانون کی اطاعت اور حفاظتِ عصمت شامل ہیں۔ یہ مستقل اقدار وحی کی رُو سے ملی ہیں اور قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ یہ اقدار مستقل اور غیر متبدل ہیں لیکن ان کے مظاہر (ثقافت) مختلف ملکوں، زمانوں اور مختلف ماحول میں مختلف ہوں گے۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو کسی طرح کی بھی وضع قطع رہنے سہنے کے طریق اور بود وباش کے انداز اگر مستقل اقدار کے خلاف نہ ہوں تو اسلامی کلچر کہلا سکیں گے۔ اس لحاظ سے دنیا بھر کے مسلمانوں میں جو مشترک قدر ہے وہ مستقل اقدار اور قرآنی ضابطہ حیات پر ایمان ہے۔ اس معیار کو سامنے رکھتے ہوئے ہم اپنے قومی اور علاقائی ثقافتی مظاہر کا جائزہ لے سکتے ہیں اور ان میں جو چیز اس معیار پر پوری نہ اُترے اسے چھوڑ دینا چاہیئے اور جو اس معیار پر پوری اُترے اسے اپنا لینا چاہیئے۔ یعنی اسلامی ثقافت کسی مخصوص زبان یا لباس یا طرزِ بود وباش کی قید نہیں لگاتی بلکہ یہ شرط عائد کرتی ہے کہ یہ سب چیزیں مستقل اقدار کے خلاف نہ ہوں۔ اس معیار کے مطابق پاکستان کی تمام علاقائی ثقافتوں کو مستقل اقدار کے پیمانے پر پرکھنے کے بعد جو ثقافت ظہور پذیر ہوگی وہ پاکستانی قوم کی اسلامی ثقافت کہلا سکے گی۔ یہی معیار مغربی مسلمانوں، عرب مسلمانوں اور افریقی مسلمانوں کے لئے ہے۔ صرف اسی ثقافت کو متشکل کرنے کے بعد ہی مغربی ثقافتی یلغار کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

کتابیات

- پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء۔ سبط حسن
- سیکولر تہذیب کا المیہ (مضمون) قاضی جاوید
- میزان فیض احمد فیض
- اسلام کیا ہے علامہ غلام احمد پرویزؒ
- حسنِ انقلاب ڈاکٹر نصیر احمد ناصر
- تبویب القرآن ″
- اسلامی معاشرے کی تعمیرِ نو ″

ثریا عندلیب

ہم ذہنی انتشار اور فکری آوارگی کا شکار کیوں ہیں؟

وطنِ عزیز پاکستان کی تشکیل کے دو ہی سال بعد معلمِ مشفق مفکرِ قرآن علامہ پرویز علیہ الرحمۃ نے قوم کی تعمیر کے سلسلے میں تعلیم و تربیت کے حوالے سے طلوعِ اسلام جون ۱۹۴۹ء میں قوم کے ذہنی انتشار اور فکری آوارگی کا جائزہ لینے کے بعد جن حقائق کا ذکر کیا تھا ان پر غور و فکر کرنے اور اپنی اصلاح و فلاح کے لئے ان پر عملاً متوجہ ہونے کی جس قدر ضرورت اس وقت تھی آج چوالیس ۴۴ سال کی طویل مدت گزر جانے پر بھی وہی ضرورت موجود ہے کیونکہ تعلیم و تربیت کے اعتبار سے ہم وہیں کے وہیں کھڑے ہیں اور اس شاہراہ پر آگے بڑھنے کے لئے ہمارے قدم اٹھتے ہیں پر نہیں اُٹھتے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ کم و بیش پوری قوم ذہنی انتشار اور فکری آوارگی کا پیکر بن چکی ہے۔ جناب پرویزؒ اس وقت ۴۹ء میں (یاد رہے یہ ۹۴ء ہے) یوں رقمطراز ہوئے تھے۔

"قوموں کی تعمیر کے دو گوشے ہوتے ہیں۔ ایک تو موجودہ نسل کی صلاحیتوں کی بیداری اور دوسرے آنے والی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت۔ ہو سکتا ہے کہ کسی قوم کی موجودہ نسل میں ارتفاع و ارتقاء کی صلاحیتیں ہی باقی نہ رہی ہوں۔ اس صورت میں اربابِ فکر و نظر کی پوری توجہات آنے والی نسل پر مرکوز ہو جاتی ہیں تاکہ یہ اُبھرنے والے بچے پیکرِ آب و گل کے بجائے زندگی کے چلتے جاگتے مجسمے بن کر سامنے آئیں۔

صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسیٰؑ نے جب بنی اسرائیل کو فرعون کے دستِ استبداد سے نجات دلائی، تو ان کے سامنے یہی مقصدِ جلیل و جمیل تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ فرعون کی انسانیت کش حکمت عملی نے کس طرح نہ صرف بنی اسرائیل کی نسلِ حاضر کو زندگی کی وسعتوں سے بیگانہ بنا رکھا ہے۔ بلکہ وہ آنے والی نسلوں کو بھی کس بُری طرح سے ذبح کئے جا رہا ہے۔ انہوں نے بنی اسرائیل کو محکومی کے چنگل سے نکالا، تو اپنی تمام سعی و کاوش آنے والی نسل کی تربیت کے لئے وقف کر دی۔ نتیجہ یہ کہ جب وہ "شاہین بچے" جوان ہوئے تو انہوں نے نظامِ کہن کی ہر فرسودہ بساط کہن کو الٹ کر رکھ دیا۔"

پھر جناب پرویز علیہ الرحمہ نے اپنی قرآنی بصیرت کے تحت اس تاریخی شہادت اور قرآنی سند کو پیش کرتے ہوئے اس وقت کے موجودہ حالات کے تناظر میں یوں ہماری رہنمائی کی۔

"حقیقت یہ ہے کہ محکومی اور آزادی میں فرق ہی یہ ہوتا ہے کہ آزادی میں ہم اپنی آنے والی نسلوں کی تربیت اپنے تصورات کے مطابق کر سکتے ہیں۔ جبکہ یہ چیز محکومی میں ممکن نہیں ہوتی۔ ہمیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس دو سال کے عرصۂ آزادی میں ہم نے اپنے بچوں کی تعلیم میں کیا تبدیلیاں پیدا کی ہیں جس سے ان کا دل و دماغ ان سانچوں میں ڈھل جائے جو ہمارے قرآنی تصورِ حیات کے آئینہ دار ہیں۔"

یہ ارفع سوچ اور انسانیت ساز تجویز عمل میں نہیں لائی گئی۔ اس باب میں صورتِ حال نہایت مایوس کن تھی۔ پرویز صاحب کا سوال تھا کہ "آپ کی راہ میں اپنے بچوں کے لئے جدید نصابِ تعلیم تیار اور نافذ کرنے کے لئے کون سا سنگِ گراں حائل ہے جس کے لئے آپ نے ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہیں؟" وائے برحال ما! فردا کا یہ انتظار چوالیس سال گزرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوا۔ کوئی بتائے کہ ہم بتلائیں کیا؟ ایک سال اور گزر جانے پر اس مردِ مومن نے پھر قوم کو پکارا اور لکھا کہ

"پاکستان والوں کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی آنے والی نسل کی صحیح تعلیم کا انتظام کریں کہ تعلیم ہی وہ قالب تیار کرتی ہے جس میں سیرتیں ڈھلا کرتی ہیں۔ آج اس بات پر نہ روئیے کہ موجودہ اوپر کا طبقہ سیرت و صلاحیت کے اعتبار سے کتنا پست ہے۔ نہ ہی اس پر کہ نیچے کا طبقہ ضبط و انضباط کی رُو سے کس قدر خام ہے۔ روئیے! اس پر کہ قوم کی آنے والی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہیں۔ حکومت کے نظم و نسق کے ہر دوسرے گوشے کی خامیوں کو برداشت کیا جا سکتا ہے۔ لیکن آنے والی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت سے متعلق گوشے کی خامیوں کو کسی صورت میں بھی گوارہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ اگر وہ نسل بھی ہماری موجودہ نسل کے نقشِ قدم پر چلتی آئی تو پھر یہ سرزمین پاک ہماری ہزار آرزوؤں کے باوجود بھی محفوظ و مامون نہ رہ سکے گی۔"

قارئینِ محترم سوچیئے اور پھر سوچیئے، کیا یہ سب کچھ غلط کہا تھا اس رجلِ رشید نے؟ اتنی لمبی مدت گزر جانے کے باوجود کیا ہماری شرحِ تعلیم میں کچھ بھی اضافہ ہوا۔ اضافہ ہوا یا کمی ہوئی! آپ اس سے بے خبر نہیں۔ کمی بھی شرمناک حد تک۔ اس کے نتیجے میں کیوں نہ ہم ذہنی انتشار اور فکری آوارگی میں مبتلا ہوں۔ ہم نے تو تعلیم کا لفظ ہی خوب پکڑ رکھا ہے جبکہ اس معلمِ مشفق نے لکھا تھا:۔

"حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں ابھی تک خواندگی (LITERACY) اور تعلیم (EDUCATION) میں فرق ہی نہیں کیا جاتا۔ ہمارے ہاں خواندگی ہی کو تعلیم سمجھا جاتا ہے۔ تعلیم کے لئے خواندگی ضروری ہے۔ لیکن خواندگی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ زندگی ہمیشہ اقدار (VALUES) کے تابع چلتی ہے۔ اقدار ہی اس کا نصب العین متعین کرتی ہیں۔ جس قسم کی اقدار انسان کے سامنے ہونگی۔ اس قسم کی اس کی زندگی ہوگی اور جس قدر ان اقدار سے کسی کو عشق ہوگا اسی قدر سعی و کاوش اور جذب انہماک سے ان کے حصول اور تحفظ کے لئے انسان سرگرمِ عمل رہے گا۔ تعلیم زندگی کی اقدار متعین کرتی ہے۔ جس قسم کی تعلیم ہوگی اسی قسم کی اقدار متعین ہو جائیں گی۔ صحیح تعلیم صحیح اقدار کی حامل ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جب فرمایا کہ یعلمھم الکتاب والحکمۃ کہ وہ انہیں نظامِ زندگی اور محکماتِ حیات کی تعلیم دیتا ہے تو اس سے مراد نوشت و خواند نہ تھی بلکہ وہی تعلیم تھی جو انسان کے سامنے زندگی کی صحیح اقدار متعین کرتی ہے اور جس کا نتیجہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی بالیدگی (دیزکیھم) ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں آج جو خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں اس کی بنیادی وجہ ہمارے سامنے زندگی کی صحیح اقدار کا نہ ہونا ہے۔ ہمارے ہاں زندگی کی سب سے بڑی قدر انفرادی خوشحالی اور حصولِ اقتدار ہے' اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم لٹیروں کا گروہ یا حیوانوں کا گلہ بن چکے ہیں۔"

ذرا کیئے اور دیکھئے کہ ۵۰ء میں کیا ہوا یہ تجزیہ اب ۹۴ء میں بھی ہم اہلِ پاکستان کے شعارِ زندگی اور کردارِ حیات کی حقیقی ترجمانی نہیں کر رہا کیا؟ کیا ہم قرآن کی عطا کردہ زندگی کی صحیح اقدار کو عملاً اپنی زندگی کا حصہ بنائے ہوئے ہیں؟ زبانی کلامی ان اقدار پر ایمان ہونے کی بات نہ کیجئے۔ ہم جانتے ہیں کہ نہ ہماری زبان ہمارے عمل کا ساتھ دیتی ہے نہ ہمارا عمل ہماری زبان کا پابند ہوتا ہے۔ ایسے مکروہ تضادات ہی نے تو ہمیں ہر دم ذہنی انتشار اور فکری آوارگی کا شکار بنا رکھا ہے۔ جناب پرویز علیہ الرحمہ نے تو آزادی ملتے ہی ہمیں قرآنی راستہ دکھاتے ہوئے ہر حقیقت سے آگاہ کیا تھا۔ آپ نے دسمبر ۵۰ء کے طلوعِ اسلام میں عام حالات کا جائزہ لینے کے بعد لکھا تھا:

"لیکن اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ قرآنی نظام اپنی حقیقی روح کے مطابق اسی صورت میں نافذ اور نتیجہ خیز ہوگا۔ جب اس کے تقاضے دل کی گہرائیوں سے ابھریں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کریں جس سے ہمارے نوجوانوں کا قلب و دماغ قرآن کے قالب میں ڈھل جائے تاکہ وہ قرآنی نظام کی محکمیت اور اصلحیت کے علیٰ وجہ البصیرت قائل ہوں اور اس کی رو سے نہ

صرف پاکستان بلکہ پوری نوعِ انسانی کی مشکلات کا حل دریافت کرنے کے قابل ہو سکیں۔
اس سے ہماری سیرت میں بلندی اور کردار میں پختگی پیدا ہوگی۔"

یہ تھی ارفع سوچ اور انسانیت ساز خواہش اس مفکرِ قرآن کی۔ اس کا رد عمل ہونا اس صورت میں ہو سکتا تھا کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا صحیح خطوط پر آغاز ہو جاتا۔ اور پرویزؒ صاحب کے نزدیک اس کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ جدید آئین میں اس امر کی بھی صراحت ہوتی کہ قوم کے بچوں کی تعلیم و تربیت کی پوری پوری ذمہ داری مملکت پر ہوگی اور اس کے بنیادی خط و خال وہ ہوں گے جنہیں قرآن نے تجویز کیا۔

وقت گزرتا رہا۔ وہ صاحبِ بصیرت اپنی پکار کو برابر دہراتے رہے لیکن اکابرین قوم نے نہ سننا تھا نہ سنا۔ دسمبر ۵۸ء میں جب صدر مملکت نے پاکستان میں تعلیمی کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا تو پرویزؒ صاحب نے 'صحیح تعلیم' اور اس سے مقصود کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ

"ہماری تعلیم کا اوّلین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اس زندگی کا تصور جس کے لئے پاکستان وجود میں آیا ہے، صاف اور واضح طور پر ذہن نشین ہو جائے اور اس کی صداقت و محکمیت کا یقین دل میں راسخ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ نہجِ زندگی اور فلسفۂ حیات اس کے سوا اور کون سا ہو سکتا ہے جسے خدا نے ہمارے لئے متعین کیا ہے۔ اسی کو اسلام یا الدّین کہتے ہیں۔ اسلام کیا ہے؟ اسلام (یا دین) کے تقاضے کیا ہیں؟ اس کا مقصود و مطلوب کیا ہے؟ وہ کس قسم کے انسان پیدا کرنا چاہتا ہے؟ ان کا نصب العین کیا ہوگا؟ ان کی سیرت و کردار کس قسم کی؟ یہ انسان کس قسم کا معاشرہ قائم کریں گے؟ اس معاشرہ کے نتائج خود اپنی مملکت کے لئے کیا ہوں گے اور باقی عالمِ انسانیت کے لئے کیا؟ اسی کا نام "اسلامی تعلیم" ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ تعلیم نہ تو وہ ہے جو اس وقت "اسلامیات" کے نام سے ہمارے سکولوں اور کالجوں میں دی جاتی ہے اور نہ ہی وہ جس کا ماحصل ہمارے "علماء" ہوتے ہیں۔ اسکولوں میں جو کچھ دینیات کے نام سے پڑھایا جاتا ہے۔ اس سے بچوں کے ذہن میں دین کے متعلق چند رسومات اور توہم پرستیوں کے سوا اور کوئی تصور مرتسم نہیں ہوتا۔ باقی رہے ہمارے کالج (بلکہ یونیورسٹیاں)، سو ان میں اسلامی تعلیم کا نہج و اسلوب وہی ہے جسے کبھی مغربی مستشرقین نے متعین کیا تھا۔ اس سے (غلط یا صحیح) کچھ معلومات تو بہم پہنچ جاتی ہیں، دین کی روح اور اس کی غرض و غایت کبھی سامنے نہیں آتی۔"

اسی سلسلے میں آگے چل کر آپ نے لکھا کہ

"ہمارے ہاں" دینی "تعلیم مذہبی مکاتب میں دی جاتی ہے اور "دنیاوی تعلیم" اسکولوں اور کالجوں میں اور اس عملی ثنویت (DUALISM) کے باوجود ہم ہر منبر اور اسٹیج سے پکارتے رہتے ہیں کہ اسلام میں مذہب اور سیاست، روح اور مادہ، دین اور دنیا میں کوئی مغائرت نہیں۔ اس قسم کی ثنویت یکسر غیر اسلامی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب ہمارے ہاں دین اور دنیا میں کوئی فرق نہیں، تو مذہبی اور دنیاوی تعلیم الگ الگ درس گاہوں میں کیوں دی جائے؟ ہمارے ہاں عصرِ حاضر کے جملہ علوم کے ساتھ دین کی تعلیم ایک ہی درس گاہ میں دی جانی چاہیئے اور اس طرح مذہبی پیشوائیت کے ادارہ کو ختم کر دینا چاہیئے۔ ایک اسلامی حکومت میں اس امر کا تصور ہی تعجب انگیز ہے کہ دینی تعلیم کے لئے الگ مدارس ہوں اور دنیاوی تعلیم کے جداگانہ سکول۔ یہ تفریق غیر مسلم حکمرانوں کے دور کی اختراع ہے۔ ہمارے بچوں کی تعلیم خواہ عمومی ہو یا فنی (ٹیکنیکل) اس میں قرآن کریم کے عالمگیر غیر متبدّل قوانینِ حیات کی حیثیت بنیادی ہونی چاہیئے۔ وہ اصول جو تکریم و حریتِ آدمیت، فرد کی ذات کی نشوونما، عالمگیر انسانیت کی ربوبیت وغیرہ کا سبق دیتے ہیں۔ ہماری تعلیم کی اصل واساس قرآن ہے اور قرآنی تعلیم کے معنی یہ ہیں کہ اسی کو حق و باطل اور صحیح و غلط کا معیار قرار دیا جائے۔ ہماری تاریخ ہو کہ سیرت، فقہ ہو یا روایات، سب کو قرآن کی روشنی میں پرکھا جائے۔ جو اس کے مطابق ہو اسے قبول کر لیا جائے۔ جو اس کے خلاف ہو اسے مسترد کر دیا جائے۔ اس سے وہ غیر اسلامی پردے اٹھ سکیں گے جو ہماری بدقسمتی سے صدیوں سے حقیقی اسلام کو ہماری نگاہوں سے اوجھل کئے ہوئے ہیں اور جب تک یہ پردے نہیں اٹھیں گے ہم دین کو اس کی اصلی شکل میں کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔"

اس کے بعد پرویز علیہ الرحمہ نے قوم کی توجہ اس بیان کی طرف دلائی جو علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے ۱۹۳۷ء میں دیا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا۔ "آج وقت کی سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ اسلامی فکر اور نہج زندگی کا ان کے حقیقی سرچشمہ کی روشنی میں مطالعہ کر کے قوم کو بتایا جائے کہ دین کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے اور کس طرح اس کے اہم تصورات و مباحث کا ان پتھریلی تہوں کے بوجھ نیچے دب کر گلا گھٹ رہا ہے جو اسلام کے ضمیر پر بُری طرح سے جم چکی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس غیر اسلامی، قشر (CRUST) کو الگ کر دیا جائے۔ تاکہ ہماری نئی نسل کے ضمیر کو آزادانہ فطری نمود کا موقع مل سکے۔" (حوالہ تقاریر و بیانات علامہ اقبال صفحہ ۲) اس حقیقت کشا اور انتہائی غور طلب بیان کے تحت جناب پرویزؒ نے تعلیمی کمیشن کے سوالنامہ کے جواب میں لکھا،

"یونیورسٹی میں قرآن مجید کی وسیع اور گہری تعلیم دی جانی چاہیئے۔ طلبا کو بتانا چاہیئے کہ اس ضابطۂ حیات کی رُو سے زندگی کا منتہیٰ کیا ہے اور اس منتہیٰ کے حصول کا طریقہ کیا۔ یعنی ایک ایسے معاشرے کی تشکیل جو تمام نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کا ذمہ دار ہو۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کی اور اسلامی فکر کی تاریخ بھی پڑھانی چاہیئے۔ اس کا مطالعہ علم و بصیرت کی روشنی میں کرانا چاہیئے اور تنقید کا مدار خالصتہً قرآن کو قرار دینا چاہیئے۔ یعنی انہیں بتانا چاہیئے کہ ہماری تاریخ میں جو کچھ قرآن کے مطابق ہے وہ حق اور صداقت کے مطابق ہے۔ جو قرآن کے خلاف ہے وہ غلط ہے۔"

اس نہایت صائب تجویز پر عمل کرنا تو کجا، بزعمِ خویش "صاحبانِ فہم و دانش" نے اسے اسلاف کی بے ادبی قرار دیا اور اس کے خلاف شور برپا کیا۔ اس کے نتیجے میں ذہنی انتشار کیسے نہ پیدا ہوتا اور فکری آوارگی کیونکر نہ پھیلتی؟ اسی کشمکش میں ہم اہلِ پاکستان کی آزادی کے دن گزرتے چلے گئے۔ ہماری سوچیں الجھتی چلی گئیں۔ نصف صدی کے قریب مدت بیت گئی ہمیں آزاد ہوئے غیروں کی غلامی سے۔ لیکن ہم وضعی اور باطل روایات کے پھندوں سے آزاد نہ ہو سکے۔ ہم نے زندگی کے بنیادی مسئلے تعلیم و تربیت کی طرف سے بھی آنکھیں بند کئے رکھیں۔ قرآن کریم کی عطا کردہ بلند اقدارِ انسانیت کو اپنا محور نہیں بنایا۔ پھر اس انتشار و فساد کی شکایت کیوں جس نے سارے معاشرے کو جکڑ رکھا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اقبالؒ اور پرویزؒ "تادمِ حیات خالصتاً قرآنی راہوں کی اپنی بصیرت فرقانی سے نشاندہی کرتے رہے اور ہمارے لئے وہ گنجینۂ حیات چھوڑ گئے جو ہر قدم پر ہمارے کام آسکتا تھا۔ آسکتا ہے۔ آسکے گا۔ لیکن ہماری شامتِ اعمال کہ ہمارے قدموں کے نشان ان نہ مٹنے والی راہوں کو نہ چھو سکے۔ اِدھر اُدھر ڈگمگاتے ہی رہ گئے۔ تاہم ابھی ہم زندہ ہیں۔ ابھی وقت ہمارے ہاتھوں سے نکل نہیں گیا۔ شاید مہلت کا وقفہ لمبا ہو جائے۔ ہم سیدھے راستے پر چل پڑیں اور ذہنی انتشار و فکری آوارگی سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔

اس سلسلے میں پھر اسی دیدہ ور کی بتائی ہوئی بات کی طرف لوٹنا ہوگا کہ سب سے پہلے اپنے نونہالانِ ملت کی تعلیم و تربیت کو قرآنی خطوط پر کرنے کا مستحکم انتظام کیا جائے۔ سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں غرضیکہ تمام درس گاہوں میں نصابِ تعلیم کو تمام علومِ حاضرہ سمیت اس طرح پڑھایا جائے کہ طالب علموں میں یہ استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ یہ جان سکیں کہ جو کچھ پڑھایا جا رہا ہے اس میں حق کیا ہے اور باطل کیا۔ کونسی چیز قرآنی نظریۂ زندگی اور مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق ہے اور کونسی ان کے خلاف۔ ان کی کیفیت یہ ہو جائے کہ یوں تحصیلِ علم سے مستقل اقدارِ خداوندی کی پابندی ان کی زندگی کا داخلی تقاضا بن جائے اور اس کے خلاف ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ ہو۔

یاد رکھئے! ہماری قوم اور ہمارے پاکستان کے حال اور مستقبل کی فوز و فلاح کا انحصار بنیادی طور پر صحیح تعلیم و تربیت پر ہے۔ اگر ہم نے یہ بنیاد نہیں رکھی، تو ہماری زندگی کا کوئی بھی معاملہ اور ہمارے ملک کا کوئی بھی گوشہ بگاڑ اور فساد سے محفوظ نہیں رہے گا۔ کل جو کچھ ہم نے کیا اور آج جو کچھ ہم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ ذہنی انتشار اور فکری آوارگی کے سوا اور کچھ ہو نہیں سکتا۔ جس میں بحیثیتِ مجموعی ہم بڑے بوڑھے، ہمارے جوان، نوجوان، بالغ بچے سب گھرے ہوتے ہیں۔ ہمیں اس بدحالی سے نکلنا ہے۔ ہم نکل سکتے ہیں۔ ضرورت صرف خالصتاً قرآنی قوانین و اقدار کو انفرادی اور اجتماعی طور پر عملاً اپنانے کی ہے۔ یہی وہ واحد طریقہ کار ہے جو ہمارے اذہان و قلوب میں مثبت تبدیلی پیدا کر کے ہمیں اس منزلِ مقصود تک پہنچا سکتا ہے جس کے لئے ہمارا پاکستان وجود میں آیا تھا۔

ضروری وضاحت

پرچہ مفت فراہم کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ پرچہ اگر آپ کے پاس بلاقیمت پہنچ رہا ہے تو اس کی ادائیگی آپ کے کسی بہی خواہ یا قرآن کے کسی شیدائی نے کی ہوگی جو دسمبر ۱۹۹۳ء میں ختم ہو جائے گی۔ پرچہ اگر آپ کو پسند ہے اور آپ اسے جاری رکھنا چاہتے ہیں تو سال ۱۹۹۴ء کے لئے اپنا زرِ تعاون مبلغ -/۱۲۰ روپے بذریعہ منی آرڈر یا ۱۴۰ روپے بذریعہ چیک ارسال فرما دیجئے تاکہ پرچے کی ترسیل منقطع نہ ہو۔ یہی پیغام بیرونِ ملک دوستوں کے لئے ہے۔ البتہ زرِ تعاون ان کے لئے:

افریقہ، ایشیا، یورپ ــــــ ۱۸ امریکی ڈالر یا ۵۴۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ــــــ ۲۰ امریکی ڈالر یا ۶۰۰ روپے

ادارہ طلوعِ اسلام

عبداللہ ثانی

وحدتِ انسانیت

۲۱ جنوری ۱۹۹۴ء کو پشاور کے ایک بڑے ہوٹل میں بین الاقوامی یومِ ادیان کے سلسلہ میں "وحدتِ انسانیت" کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد کیا گیا جس میں بڑے بڑے مذاہب کے دانش وروں نے موضوع پر اپنے اپنے خیالات اور مذہبی کتابوں سے حوالہ جات دیئے۔ اس سیمینار میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، پارسی اور بہائی مذہب کے کئی لوگ شامل ہوئے۔ راقم نے مسلمانوں کی نمائندگی کی۔

صدرِ محترم۔ معزز مہمانِ خصوصی اور سامعین گرامی۔

قابلِ صد ستائش اور لائقِ ہزار تبریک ہیں وہ قوتیں جو کسی معاوضے یا صلے کے حصول کی تمنا کئے بغیر انسانی منفعت کے لئے مصروفِ عمل ہوتی ہیں۔ یہ قوتیں کبھی تو انفرادی حیثیت سے اور کبھی اجتماعی طور پر اس فکر میں مبتلا رہتی ہیں کہ کیسے انسان کو اس کا کھویا ہوا "فردوس گم گشتہ" واپس دلا دیا جائے اور یہ ایک بار پھر انسان بن کر کرۂ ارض کو جہنم سے جنت بنا دے۔ آسمان نے یہ منظر سینکڑوں بار دیکھا ہے کہ انسان زمین پر موجود ایک برادری میں باندھا ہوا تھا۔ تیری اور میری کا تصور نہیں تھا۔ سونے اور چاندی کے ڈھیر اس کے سامنے مٹی اور راکھ کے ڈھیروں سے بھی کم تر درجہ رکھتے تھے۔ کاغذ کے نوٹ کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق زمین سے جو کچھ حاصل کرتا وہی اس کا ہوتا تھا۔ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت سے زیادہ مقدم سمجھتا تھا۔ پھر اچانک انسان ایک دوسرے کا دشمن ہو گیا۔ اس نے اپنے آنے والے کل کو غیر محفوظ محسوس کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھائی نے بھائی کے گلے پر چھری پھیر دی۔ اب اسے اتنی بھی سمجھ نہیں تھی کہ اس لاش کے ساتھ کیا کروں۔ ایک کوّے نے اسے لاش ٹھکانے لگانے کا طریقہ سجھایا اور یہیں سے "تیری" اور "میری" کا آغاز ہوا۔ خود انسان انسان کے خون کا پیاسا ہونے لگا۔ اختلافات نے نئی نئی اشکال بنانا شروع کیں۔ کہیں ذات کا جھگڑا پیدا ہوا تو کہیں

رنگ کا، کہیں نسل کی کشیدگی پیدا ہوئی تو کہیں خون کی برتری، کہیں مذہب نے ایک دوسرے کے گلے کاٹے تو کہیں جغرافیائی تعصب نے، کہیں مٹی کا تنازعہ پیدا ہوا تو کہیں علاقائی وصف سامنے آیا۔ غرض انسانوں نے خود اپنے ہی ہم نسل انسان کے خون کا پیاسا ہونے لگا۔ اس وحدت کو پھر سے تازہ کرنے کے لئے انبیاء آئے جنہوں نے انسانوں کو ایک خدائی لڑی میں پرونے کا درس دینا شروع کیا۔ اس وحدتِ انسانی کا یہ بھولا ہوا سبق کبھی تو انبیاء نے یاد دلایا اور کبھی نیک ارواح نے اس کام کو آگے بڑھایا۔ ذاتی مفادات نے ہمیشہ وہ گل کھلائے کہ آسمان تکتا ہی رہ گیا۔ اس میں ان لوگوں کی کاوشیں کبھی تو برومند ہوئیں اور کبھی خود ان کو اپنی جانیں تکمیل مشن کے لئے قربان کرنا پڑیں۔ لیکن وہ اپنے مشن سے باز نہ آئے۔ چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری جاری ہے۔ کرۂ ارض جوں جوں سکڑتا گیا مفادات ساتھ ساتھ بڑھتے گئے۔ تا آنکہ زمین پر ایسا وقت آیا کہ انسان خود اپنے ہاتھوں اپنا خون بہا رہا تھا۔ کروڑوں انسان ناحق قتل ہو چکے تھے۔ آسمان آتش و آہن برسا رہا تھا۔ انسان پر اس کی اپنی زمین تنگ ہو چکی تھی۔ وَ قَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ٥ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ٥ بے ساختہ انسان پکار رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، یہ تو وہی دن ہے جس کی خبر ہمیں نے (خدا نے) تمہیں پہلے ہی دے رکھی تھی۔" ہر طرف سے ایک چیخ سنائی دے رہی تھی کہ ایک ہو جاؤ۔ ایک ہو جاؤ۔ بس ایک ہو جاؤ۔ لیکن اس گھن گرج میں کون تھا جو یہ سنتا کہ یہ کیسی آواز آ رہی ہے۔ انسان کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹنے والا تھا کہ اتنے میں خود انسان نے ایک میز پر بیٹھ کر بات کرنے کو ترجیح دی اور جمعیت اقوام کے نام پر ایک ادارے کی "کمزور" بنیاد رکھی، جس کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ خود اس کے نام ہی میں پوشیدہ تھی۔ وقت کے مفکر ایک ایک بار پھر اس غلطی کی نشاندہی کی۔ لیکن جہاں مفادات پیشِ نظر ہوں وہاں آنکھیں نورِ بصیرت سے محروم ہو جاتی ہیں۔ اس موقعہ پر وقت کے مفکر علامہ اقبالؒ نے فرمایا:۔

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام — پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود — اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم
مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام — جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم

اور اس طرح ایک بار پھر جمعیتِ اقوام کی اصطلاح سامنے آئی جس نے آج تک نفرتوں کے علاوہ کچھ نہیں دیا۔ جب تک یو۔ این۔ او (U.N.O) یعنی U.NO (تم کچھ نہیں ہو) رہے گی اس وقت تک یہ اپنے مقاصد حاصل نہیں کر سکے گی۔ اس کا نام ہی تبدیل کرنا چاہیئے۔ اسے UNITED MANKIND کا نام دینا چاہیئے تاکہ سب ایک دوسرے کو U.MAN (یعنی تم انسان ہو) یا U-MAN-KIND، تم مہربان انسان ہو کہہ کر پکاریں اور پھر انسانی اقدار کو سامنے رکھ کر ایک ایسی تنظیم بنائی جائے جس میں ہر انسان بلا کسی امتیازی تفریق کے خود کو اس تنظیم

کا حصّہ سمجھے۔ اس وقت تک کسی بھی تنظیم کے متعلق یہ کہنا کہ یہ کامیابی سے ہمکنار ہوگی ایک خام خیال ہے۔ کسی بھی تنظیم میں اگر نظم نہیں تو وہ تنظیم ہی کہلانے کی مستحق نہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے جب خانہ کعبہ کی تعمیر کی تو باپ بیٹے کو وحی کے ذریعے یہ حکم ہوا کہ اب جبکہ تم دونوں نے بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے محسوس شکل میں ایک مرکز کی بنیاد رکھ دی ہے تو بنی نوع انسان کے نام عام اعلان کردو کہ یہ وہ مقام ہے جہاں سے رشد و ہدایت کے سوتے پھوٹیں گے۔ انسانیت کے نام اس نشو و نما دینے والے کی طرف سے اعلان کردو کہ کائنات کو وہ ایک قانون کے تحت چلا رہا ہے تو پھر تم ایک نظم اور ضبط کے ساتھ اکٹھے کیوں نہیں ہوتے ہو۔ فرق صرف یہ ہے کہ انسان کے علاوہ ہر شے مجبور ہے اور تم (انسان) آزاد اور صاحبِ ارادہ ہو۔ تو سنو! وہ تمہیں اس مرکز کی طرف بلاتا ہے جس کی بنیاد باپ بیٹے نے رکھی تھی۔ اس کی یہ دعوت بنی نوع انسان کے نام ہے۔ اس میں کوئی مذہبی رنگ نسل، جغرافیائی یا علاقائی امتیاز نہیں۔ چنانچہ انسانیت کے نام اعلانِ عام ہوا کہ

وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ۝ لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَ یَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِیْۤ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰی مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِیْرَ ۝ (۲۲/۲۷-۲۸) سورۃ الحج

مفہوم:۔ (اس کے بعد ہم نے ابراہیم سے کہا کہ اب) تم بنی نوع انسان کے نام اعلان کردو کہ وہ اپنے معاملات میں آخری دلیل و حجت (فیصلہ) کے لئے یہاں آیا کریں۔ دنیا کے دور دراز گوشوں سے لمبی لمبی مسافتیں طے کرتے، پاپیادہ یا ایسی سواریوں پر جو سفر کی مشقت سے تھک کر چور ہو جائیں۔ وہ یہاں اس لئے آئیں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ نظام ان کی (یعنی نوعِ انسان کی) منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ اور ہم نے جو مویشی انہیں دے رکھے ہیں انہیں اللہ کا نام لے کر اس اجتماع کے مقررہ دنوں میں ذبح کریں اور ان کا گوشت خود بھی کھائیں اور (اگر وہاں کوئی) تکلیف زدہ محتاج ہو تو اُسے بھی کھلائیں۔

(کھائیں پئیں بھی اور باہمی مشاورت سے وہ تدبیریں بھی سوچیں جن سے) ان کی ملّی زندگی کی تمام کثافتیں دُور ہو جائیں اور وہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو جائیں (جنہیں انہوں نے نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں اپنے اوپر لے رکھا ہے) اور

اس طرح پوری کی پوری امت اس مرکز کی نگہبان بن جائے جو دنیا میں انسانوں کی حریت و آزادی اور قوت و اقتدارِ خداوندی کا نشان ہے اور جسے اس باب میں شرفِ اوّلیت اور سبقت حاصل ہے۔

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اعلان کیا:۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ فِیْہِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰھِیْمَ ۝ وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا ؕ وَ لِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا ؕ وَ مَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (۳/۹۵-۹۶)

مفہوم: ان سے کہو کہ دنیا میں سب سے پہلے جس مقام کو نوعِ انسان کا مرکز تجویز کیا گیا تھا، وہ مکہ تھا۔ اسی مرکز سے اقوامِ عالم کو ثبات و استحکام اور نشوونما کا سامان ملنا تھا اور اسی کو وہ روشنی کا مینار بننا تھا جس سے عالمگیر انسانیت کے سامنے زندگی کا صحیح راستہ آسکے۔ یہ راہ نمائی بڑی بیّن اور واضح ہے۔ یہی وہ مرکز تھا جہاں سے ابراہیم کو اقوامِ عالم کی امامت کا مقام حاصل ہوا تھا (۲/۱۲۴-۲۵)۔ اس کی خصوصیتِ کبریٰ یہ ہے کہ جو شخص بھی اس مرکز میں داخل ہو جائے اسے ہر طرف سے امن اور سلامتی حاصل ہو جائے گی اس کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے ہیں (۲۲/۲۵)۔ سو جو لوگ بھی اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھیں، وہ یہاں جمع ہوں اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ جس نظام کا یہ مرکز ہے وہ نوعِ انسان کے لئے کس قدر منفعت بخش ہے (۲۲/۲۸) بشرطیکہ اُن کا اس طرح جمع ہونا خالص خدا کے لئے ہو، گروہ بندانہ مصلحتوں کے پیشِ نظر نہ ہو۔

یہ ہیں اس مرکزِ نظامِ خداوندی کی خصوصیات۔ اب ظاہر ہے کہ جو لوگ اس قسم کے نظام اور اس کے مرکز سے انکار کریں، وہ اپنا ہی نقصان کریں گے۔ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ خدا تو تمام اقوامِ عالم سے بے نیاز ہے۔

اس اعلانِ عام کے بعد ہوا کیا؟ ہوا یہ کہ اللہ کا پہلا گھر ثانوی حیثیت اختیار کر گیا اور قبلہ اوّل بیت المقدس قرار دے دیا گیا۔ آج بھی عالمِ اسلام خدا کے اعلان کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور انسانوں کے وضع کردہ قبلہ کے لئے خون بہا رہے ہیں۔ جس گھر کو خدا نے بنی نوع انسان کے لئے امن اور سلامتی کا گھر قرار دیا اُس گھر

ہیں خدا کے حضور کلاشنکوفوں کے سائے میں کھڑے ہو کر امن کی دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ خدا کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے تلاشی لی جاتی ہے۔ وہاں انسانیت کی جو تذلیل ہوتی ہے اس کا منظر پیش کرنے سے خوف آتا ہے کہ یہ مناظر میری آنکھوں کے دیکھے ہوئے ہیں۔ اس آیت کے آخری حصہ پر ایک بار پھر نظر ڈالی جائے کہ "خدا تو تمام اقوامِ عالم سے بے نیاز ہے"۔ آیئے ایک اور مقام پر نظر ڈالیں:۔

وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ۟ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى ۟ وَ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ (2:125)

مفہوم:۔ ابراہیم کا قائم کردہ یہی وہ نظام تھا جس کا مرکز، کعبہ قرار دیا گیا تھا، "تاکہ تمام نوعِ انسان، اپنے اختلافات دُور کر کے، ایک نقطہ پر جمع ہو جائے اور اس طرح، ہر قسم کے خطرات سے (جو گروہ بندیوں اور قومیت پرستی کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں) محفوظ و مامون ہو جائے۔ یہی وہ مرکز ہے جس پر نوعِ انسان نے آخرالامر جمع ہونا ہے۔ اسی لئے انسانیت اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہو سکے گی

اگر تم بھی مقامِ ابراہیمؑ کو حاصل کرنا چاہتے ہو، تو اس کے مسلک و منہاج کے پیچھے پیچھے چلو۔

ہم نے (معمارانِ حرم) ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ سے تاکید کی تھی کہ وہ اس مقام کو عالمگیر نظامِ انسانیت کا مرکز بنائیں اور اسے انسانوں کے خود ساختہ تصورات و معتقدات سے پاک و صاف رکھ کر، اس جماعت (۲/۱۴۳) کی تنظیم و تربیت کے مخصوص کر دیں جس کا شیوۂ زندگی یہ ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کے سامنے جُھک کر اور ان کی پوری پوری اطاعت کر کے ایسی پوزیشن اختیار کر لے کہ وہ تمام اقوامِ عالم کی نگران و پاسباں ہو، ان کے الجھے ہوئے معاملات کو سنوارنے اور ان کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو مجتمع کرے۔

حاضرینِ گرامی!

اس وقت میں اس اختلاف میں جانا نہیں چاہتا کہ جس مقام کو بنی نوع انسان کے لئے مرکز قرار دیا گیا تھا وہ صرف مسلمانوں کی عبادت گاہ بنا دیا گیا۔ یہ مذہب کی کرامات ہیں۔ دین کا اس کے ساتھ دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ مذہب اور دین دو مختلف سمتوں کی طرف جانے والے راستوں کے نام ہیں۔ دین صراطِ مستقیم ہے جبکہ

مذہب پُراز تذبذب ہے۔ اس کی تفصیل میں اگر جاؤں تو پھر موضوع سے بہت دُور چلا جاؤں گا۔ حالانکہ یہ مذہب ہی ہے جس نے انسانیت کو آج لاکھوں نہیں کروڑوں ٹکڑوں میں تقسیم کیا ہوا ہے۔ مذہب ہی کی وجہ سے خود انسان، انسان کے خون کا پیاسا بنا ہوا ہے۔ ورنہ خدا نے تو بنی نوع انسان کو ایک ہی امت اور ایک ہی نفس واحدہ سے پیدا کیا تھا۔ ارشادِ خداوندی ہے:۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ (۱۰/۱۹)

مفہوم:۔ (اے رسولؐ! تمہاری دعوت، جس کی یہ اس قدر مخالفت کرتے ہیں، اس کے سوا کیا ہے کہ تم نوعِ انسان کے اختلافات مٹا کر انہیں ایک عالمگیر برادری بنانا چاہتے ہو اور یہ چیز اسی صورت میں ممکن ہے کہ تمام انسان ایک ضابطۂ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں۔ اسی کا نام توحید ہے جو شرک کی نقیض ہے۔ تمہاری یہ دعوت نہ کوئی نئی دعوت ہے نہ انہونی بات)۔ نوعِ انسان کی تمدنی زندگی کی تاریخ یہ ہے کہ سب سے پہلے دور میں (جب ان کے مفاد میں باہمی تصادم نہیں ہوا تھا) سب ایک برادری کی شکل میں رہتے تھے (۲/۲۱۳)۔ اس کے بعد، انفرادی مفاد پرستیوں نے ان میں اختلافات پیدا کرنے شروع کر دیئے اور یہ ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے (۲/۳۶)۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ہم انہیں پیدا ہی اس طرح کرتے کہ یہ اختلافات نہ کر سکتے یا اگر یہ اختلافات کرتے تو ہم اپنی قدرت سے ان اختلافات کو زبردستی مٹا دیتے (لیکن ہم نے اس کے لئے ایک اور قاعدہ مقرر کیا جس سے انسانوں کی آزادی سلب نہیں ہوتی تھی۔ ہم نے وحی کے ذریعے ایسی تعلیم عطا کی جس سے یہ اختلافات مٹ سکتے تھے (۲/۳۸)۔ مفاد پرست لوگ اس تصور کی مخالفت کرتے ہیں۔ لیکن اس سے ہمارا پروگرام رُک نہیں سکتا۔ نوعِ انسان کو آخر الامر ایک عالمگیر برادری بن کر رہنا ہے)۔

انسانی تخلیق دراصل نفسِ واحدہ یعنی ایک ہی نفس سے ہوئی ہے اس لئے بھی آخر الامر اس نے ایک ہو جانا ہے۔ قرآنِ کریم نے انسان کو اس کی تخلیق سے متعلق انتہائی خوبصورت انداز میں بتایا ہے۔ سورۂ نساء کی پہلی آیت کچھ یوں ہے:۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ

وَّ خَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَ بَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا كَثِيۡرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِهٖ وَ الۡاَرۡحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيۡكُمۡ رَقِيۡبًا ۝ (4:1)

مفہوم: اے نوعِ انسان! اپنے نشوونما دینے والے کے قانون کی نگہداشت کرو جس نے تمہاری پیدائش کی ابتدا ایک جرثومۂ زندگی (LIFE - CELL) سے کی (۹/۷۹ : ۳۹/۴) ازاں بعد یہ جرثومہ دو حصّوں میں تقسیم ہوگیا (SPERMATAZOOM OF OVUM) جس سے نر و مادہ کی تقسیم وجود میں آئی اور یوں نر و مادہ کے اختلاط سے، اس نے کرۂ ارض پر کثیر آبادی پھیلادی، جو مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہے (جب نوعِ انسان، اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں تو انسانوں کی خودساختہ تقسیم و تفریق کے کیا معنی ہیں؟ تم تمام انسانوں کو ایک برادری سمجھو) اور اس طرح خدا کے نظامِ ربوبیت کی نگہداشت کرو جس کے ذریعے تمہاری وہ ضروریات پوری ہوتی ہیں جن کے لئے تم ایک دوسرے کے تعاون کے محتاج ہو (۱۴/۳۴)۔

خدا کے نظامِ ربوبیت کے قیام کی ابتدا، اپنے خاندانی رشتے استوار کرنے سے کرو (جب یہ ہوجائے تو پھر اس حلقہ کو وسیع کرتے چلے جاؤ، تاآنکہ پوری کی پوری انسانیت اس کے دائرہ کے اندر آجائے)۔ اگر تم نے ایسا کیا تو قانونِ خداوندی تمہاری ہر طرح سے نگرانی اور نگہبانی کرتا جائے گا۔

اس حقیقت کو سورۂ لقمان کی آیت ۲۸ میں اس طرح واضح کیا گیا ہے۔

مَا خَلۡقُكُمۡ وَ لَا بَعۡثُكُمۡ اِلَّا كَنَفۡسٍ وَّاحِدَةٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌۢ بَصِيۡرٌ ۝ (31:28)

مفہوم: اس کے قانون کی ناپیداکنار وسعتوں کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ جب سے انسان کی پیدائش کا سلسلہ شروع ہوا ہے اس وقت سے آخری وقت تک، تمام انسانوں کی تخلیق، اور ان کی بعثت (دوبارہ اٹھنا) اس کے نزدیک ایسے ہے جیسے کسی ایک متنفس کی تخلیق و بعثت (اور صرف یہی نہیں کہ اس نے انسانوں کو پیدا کر دیا اور کام ختم ہوگیا) وہ ہر ایک کی سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ (تم افراد کو الگ الگ دیکھتے ہو، اس کی نگاہ عالمگیر انسانیت پر ہوتی ہے۔ تم اجزا پر نظر رکھتے ہو وہ کُل کو بھی دیکھتا ہے۔)

آیئے ذرا اس آیت پر نظر ڈالیں کہ خداوند کریم "جز" کے خاتمے اور قتل کو "کل" کے خاتمے اور قتل کے برابر سمجھتا ہے۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَ مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ز ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ۵ (۵/۳۲)

مفہوم:۔ یاد رکھو! جو شخص کسی دوسرے کو قتل کر ڈالے ۔۔۔ بجز اس کے کہ وہ جرم قتل کے قصاص میں ہو (یعنی قتل ناحق کے لئے سزائے موت کے طور پر) یا ملک میں فساد برپا کرنے والے مجرمین کو قانون کے مطابق موت کی سزا دی جائے ۔۔۔ تو اس قسم کے بے گناہ قتل کے متعلق یوں سمجھو گویا اس شخص نے (ایک فرد کو قتل نہیں کیا) پوری کی پوری نوعِ انسان کو قتل کر دیا۔ اس کے برعکس جس شخص نے کوئی ایک جان بچالی، تو اس نے گویا پوری نوعِ انسان کی جان بچالی۔

یہی نہیں کہ انہیں یہ حکم صرف ایک بار دیا گیا اور پھر فراموش کر دیا گیا۔ ان کی طرف ہمارے پیغمبر، واضح احکام و دلائل لے کر آتے رہے اور انہی باتوں کو دہراتے رہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی اکثریت کا یہ عالم رہا (اور اب تک ہے) کہ وہ حدود شکنی اور زیادتی کرتے رہے۔

اس آیت کی رُوح کو تو ہم سمجھنے سے قاصر رہے، البتہ تجارتی نشان (TRADE. MARK) کے طور پر بعض ہسپتالوں کی پیشانی پر لکھ کر فرائض سے خود کو مبرا قرار دے دیا۔ غور سے دیکھیں! مذہب کے نام پر فساد پھیلا کر کتنی جانیں ناحق لے لی جاتی ہیں۔ کبھی آپ نے اس حقیقت پر غور بھی کیا ہے کہ حیوانات دیگر اشیائے کائنات میں کسی بھی مسئلے پر اختلافات نہیں ہوتے۔ ان کی یہ وحدت بالارادہ نہیں بلکہ مجبوری کی ہے۔ انسانوں میں اس طرح وحدت پیدا کرنا ہرگز مقصود نہیں۔ ورنہ انسان اور حیوان میں پھر کوئی فرق نہ ہوتا۔ انسان بھی بعض طبعی خصوصیات کی بنا پر حیوان ہی تو ہے، لیکن حیوانِ ناطق کے ساتھ ساتھ علم و بصیرت اور اختیار و ارادہ کا بھی مالک ہے۔ یہ سوچ سمجھ کر اپنے اختیار و ارادہ سے ایک برادری کے افراد ہیں۔ انسانی وحدت کو ایک اور خوبصورت انداز سے یوں بتایا گیا ہے:

وَ لَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ۵ وَ لِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ۵ (۴۳/۳۳-۳۴)

مفہوم :۔ اگر ہمارے پروگرام میں یہ نہ ہوتا کہ تمام نوعِ انسانی کو آخر الامر ایک عالمگیر برادری بننا ہے تو ہم ان لوگوں کو جو ہمارے نظامِ ربوبیت سے انکار کر کے سب کچھ اپنے لئے سمیٹ لینا چاہتے ہیں ایسا بے لگام چھوڑ دیتے کہ وہ بے حد و حساب دولت جمع کر لیتے جس سے ان کے گھروں کی چھتیں اور سیڑھیاں تک چاندی کی ہو جاتیں اور ان کے گھروں کے دروازے اور تخت جن پر بیٹھتے ہیں سونے کے ہو جاتے (لیکن طبقات میں اس قدر تفاوت سے نوعِ انسان ایک برادری نہ بن سکتی۔ اس لئے ہم اس قسم کی تعلیم بھیجتے رہتے اور ایسی جماعتیں پیدا کرتے رہتے ہیں جو دولت کی اس غلط تقسیم کے خلاف آواز بلند کرتی ہیں اور اس حقیقت کو عام کرتی ہیں کہ)

وَ مَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۝ (۴۳/۳۶)

مفہوم :۔ انسانی زندگی کا مقصود و منتہیٰ صرف اس دنیا کی آسائش و آرائش نہیں۔ اس کی مستقبل کی زندگی کی فلاح و بہبود بھی ہے۔ یہ مقصد اُسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ انسانی معاشرہ قوانینِ خداوندی کے تابع رہے۔ یہ ہے وہ طریق جس سے اکتسابِ رزق کی استعدادوں میں تفاوت کے باوجود نوعِ انسانی ایک عالمگیر برادری کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔

عزیزانِ محترم۔ ہم کرتے کیا ہیں؟ بہشت کے حصول کے لئے اپنی برادری اور ہم جنس کو ناحق قتل کر دیتے ہیں اور اپنے تئیں خوش ہو جاتے ہیں کہ اس قتل کے بدلے ہمیں یقیناً جنت ملے گی۔ کسی بھی مذہب یا مسلک سے تعلق رکھنے والے کی جان کی حفاظت خود فریضۂ مسلم ہے۔ ملاحظہ ہو!

اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ (۲۲/۴۰)۔

مفہوم :۔ یہ وہ مظلوم ہیں جنہیں ان کے گھروں تک سے ناحق نکال دیا گیا۔ ان کا کوئی جرم نہیں تھا' بجز اس کے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے' (لیکن سرکش قوتیں اس کی کب اجازت دیتی ہیں کہ کوئی اپنی مرضی کے مطابق کسی کو اپنا معبود بنا لے؟) تم سوچو کہ اگر

اللہ اس کا انتظام نہ کرتا کہ ایک گروہ کی روکتھام دوسرے گروہ کے ذریعے ہو سکے (اور وہ سرکش لوگوں کو بدلگام چھوڑ دیتا کہ وہ، جو جی میں آئے کرتے چلے جائیں تو اور چیزیں تو ایک طرف) کسی قوم کی عبادت گاہ تک بھی دنیا میں محفوظ نہ رہتی ـــ خانقاہیں، گرجے، یہودیوں کے معبد، مساجد جن میں خدا کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے ـــ سب کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے۔ لہٰذا، جو جماعت بھی حق انصاف کی مدافعت کے لئے اٹھے گی (جس میں پرستش کی آزادی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے) اللہ کا قانون اس کی ضرور مدد کرے گا۔ یاد رکھو! خدا بڑی قوتوں کو مالک اور سب پر غالب ہے۔

قرآنِ کریم نے امتِ واحدہ یا وحدتِ انسانیت کے لئے طریقہ کار بھی بتا دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جس تصوّر کو آج سے چودہ صدیاں قبل پیش کیا گیا تھا اس تصوّر کی طرف آج انسان خود بخود بڑھ رہا ہے۔ وحدت انسانیت کی ضرورت کا احساس بڑی شدّت اختیار کر چکا ہے۔ یہ بھی ایک قدم ہے کہ انسان پورے کرۂ ارض کے باسیوں کے لئے ایک ایسی زبان یا بولی ایجاد کرنے کی کوشش میں مصروف ہے کہ جس سے ایک انسان دوسرے انسان کے قریب ہو جائے گا۔ وہ اپنا دکھ درد بڑی آسانی سے اپنے ہی ہم جنس کو بتا سکے گا۔ حیوان کتنا ہی بیمار کیوں نہ ہو وہ اپنی بیماری کا اظہار الفاظ میں نہیں کر سکتا بلکہ ماہرینِ حیوانات کسی جانور کی بیماری کا اندازہ اس کی ظاہری علامات سے لگاتے ہیں۔ یہ بھی اس لئے کہ جانور مجبور ہے، بے بس ہے، بے اختیار ہے اور کسی بھی ارادے کا مالک نہیں ہے۔ اس کے برعکس انسان نہ تو مجبور ہے، نہ ہی بے بس بلکہ صاحبِ ارادہ ہے۔ مجبور وہی ہے جو کسی جبر کے تحت زندگی گزارے۔ حیوانات فطرت کی طرف سے مقرّر کردہ جبر کے تحت زندگی گزارتے ہیں اس لئے مجبور ہیں۔ انسان پر فطرت کی طرف سے کوئی جبر نہیں بلکہ خود انسان کی طرف سے انسان پر جبر مسلّط کیا گیا ہے۔ زمین پر لکیریں خدا کی طرف سے نہیں کھینچی گئی ہیں۔ یہ لکیریں اپنے مفادات کے تحفّظ کی خاطر کھینچی گئی ہیں۔ پورا کرۂ ارض انسانوں کا مسکن ہے، جہاں چاہے جا سکتا ہے، خدا کی طرف سے کوئی پابندی نہیں۔ یہی ربّ العالمینیت ہے اور یہی ہم سے تقاضا کرتا ہے۔ قرآنِ کریم نے وحدتِ انسانیت کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ایک دن .....

لِيَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۸۳/۵-۶)

مفہوم:۔ اور اس طرح وہ انقلابِ عظیم واقع ہوگا جس میں عالمگیر انسانیت، خدا کا نظامِ ربوبیت قائم کرنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝ (۸۳/۷)

اُس وقت، ان لوگوں کا اعمالنامہ جنہوں نے انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے طبقات

ہیں تقسیم کر رکھا ہے، خود انہیں جکڑ باندھ کر رکھ دے گا (اور یوں ان کا اپنا وضع کردہ نظام خود ان کی تباہی کا موجب بن جائے گا۔ ستر سال کے بعد آخر کار تین سال قبل ایک انسانی وضع کردہ نظام ہچکیاں لے لے کر دم توڑ گیا)۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ نظام قائم ہو کر رہیگا۔ غور فرمایئے!

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (۹/۳۳)

مفہوم:۔ اللہ نے اپنے رسول کو ضابطہ حیات، یعنی دینِ حق دے کر بھیجا ہی اس لئے ہے کہ یہ نظام تمام نظامہائے عالم پر غالب آئے، خواہ یہ بات ان لوگوں پر کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے جو خدا کے ساتھ اوروں کو بھی شریکِ حکومت کرنا چاہتے ہیں۔

ایسا کیوں ہوگا؟ اس لئے کہ

وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (۱۳/۱۷)

اسی نظام کو بقا حاصل ہے جو کرۂ ارض پر رہنے والے نوعِ انسان کے لئے نفع بخش ہو۔

سامعینِ محترم! ہمارے ہاں یعنی انسانوں کی دنیا میں برتری کے معیار مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ کسی نے جغرافیائی وابستگی کو وجہِ افتخار بنا دیا ہے تو کسی نے رنگ و نسل کا سہارا لے رکھا ہے، کوئی خون کی پاکیزگی کو اعلیٰ درجہ دیتا ہے، جسے خود خدا نے حرام قرار دے دیا ہے۔ حالانکہ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ اگر خون کو کسی قسم کی پاکیزگی حاصل ہوتی تو یقیناً خون کی رنگت ایک دوسرے سے مختلف ہوتی۔ (میں خون کے گروپوں کی بات نہیں کر رہا)۔ یہ بھی خدا کا شکر ہے کہ خون کا رنگ انسان تو کیا حیوانات کا بھی سُرخ ہے۔ اس تفریق کو بھی خدا نے کتنے خوبصورت انداز میں مٹا دیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ۝ (۳۰/۲۲)

مفہوم:۔ اس قانونِ کائنات سے ایک اور حقیقت کی طرف غور کرو۔ تم دیکھتے ہو کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کس قدر تنوع پایا جاتا ہے۔ لیکن اس تنوع کے باوجود ساری کائنات ایک مصرعۂ موزوں کی طرح غیر منقسم اور متحدہ وحدت (UNI-VERSE) ہے۔ اسی طرح انسانوں میں رنگ اور زبان کا اختلاف ہے۔ لیکن وہ اس اختلاف کے باوجود، ایک امّتِ واحدہ کے افراد ہیں (۲/۲۱۳)۔ اس میں بھی اربابِ علم و بصیرت کے لئے حقیقت

تک پہنچنے کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ ابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ۝ (۳۰/۲۳)

مفہوم:- اس کی ایک مثال اور لو، تم رات کو سوتے ہو اور دن کو تلاش معاش کرتے ہو (لیکن سکون اور حرکت کے ان دو متضاد عناصر کی یک جہتی سے زندگی کی گاڑی آگے بڑھتی ہے) یقیناً اس میں بھی ان لوگوں کے لئے جو گوش ہوش سے کام لیتے ہیں ہمارے قانونِ وحدت کے سمجھنے کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔ (اس سے آگے سمجھانے کے لئے بادل اور بجلیوں کی مثال دی ہے۔ طوالت آڑے آرہی ہے)۔

انسانوں اور حیوانوں کے رنگ و نسل کی اس تفریق کو ایک اور خوبصورت انداز سے پیش کیا گیا ہے۔

وَ مِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ ۝

(۳۵/۲۸)

مفہوم:- اسی طرح انسان، دیگر حیوان اور مویشی بھی مختلف قسموں کے ہیں۔

صحیفۂ فطرت کے یہ اوراق جو قوانینِ خداوندی کی زندہ شہادات ہیں سب کے سامنے کھلے رہتے ہیں، لیکن ان قوانین کی عظمت کے سامنے وہی لوگ جھکتے ہیں جو ان شہادات پر علم و بصیرت سے غور و فکر کرتے ہیں۔ یہی لوگ "علماء" کہلانے کے مستحق ہیں اور یہی جان سکتے ہیں کہ خدا کا قانون کس قدر غلبہ کا مالک ہے اور جو اس کے مطابق چلتا ہے وہ اسے کس قدر سامانِ حفاظت عطا کرتا ہے۔

لیکن کیا کیا جائے۔ جہاں ایک طرف قرآن کریم ان لوگوں کو "علماء" کہہ کر پکارتا ہے جو کائنات کی پھیلی ہوئی وسعتوں پر غور و فکر کرتے ہیں، تو دوسری طرف ہم انہیں علماء کہتے ہیں جو یکسر اس علم سے خالی ہوتے ہیں۔ ہمارے نزدیک علماء کا معیار ایک وزنی پگڑی اور قدِ آدم جتنی عصا ہاتھ میں تھامے جبہ پہنے ہوئے ہو۔ یاد رہے۔ قرآنِ کریم میں علماء کا ذکر صرف دو مقامات پر ہوا ہے۔ بہرحال انسان ہونے کی جہت سے ایک انسان بلا رنگ و نسل، خون اور زبان کے اختلاف کے واجب التکریم قرار دیا گیا ہے۔

وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْۤ اٰدَمَ (۱۷/۷۰)

ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم بنایا ہے۔

تو بات ہو رہی تھی وحدتِ انسانیت کی۔ یہاں میں اس وحدتِ انسانی سے متعلق مغرب کے مفکرین کی سینکڑوں آرا پیش کر سکتا ہوں لیکن وقت کی کوتاہ دامنی آڑے آ رہی ہے۔ صرف ایک آدھ حوالے کے طور پر پیش کرنا آج کے موضوع کے ساتھ انصاف کے مرادف سمجھوں گا۔

ہانز ڈریش (HANS DRIESH) اپنی کتاب (THE PROBLEM OF INDIVIDUALITY) (مسئلۂ انفرادیت) میں اس موضوع پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے کہ یہ نظریہ کہ تمام کائنات ایک منظم وحدت ہے۔ وحدتِ نظم (MONISM OF ORDER) کی اصطلاح سے تعبیر کیا جانا چاہیئے۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ وحدتِ نظم کا یہ تصور نظمِ کائنات کے متعلق دیگر تمام تصورات کو منسوخ کر دیتا ہے۔ اس کی رُو سے کائنات میں الگ الگ نظام کہیں باقی نہیں رہتے، بلکہ تمام کی تمام کائنات وحدتِ نظم کا مظہر بن جاتی ہے۔ اس وحدتِ نظم کے پیشِ نظر "قوانینِ فطرت" کے تصور میں بھی تبدیلی کرنی پڑے گی۔ کیونکہ اس صورت میں متعدد "قوانین" نہیں بلکہ صرف ایک قانون کارفرما نظر آئے گا اور یہی وہ واحد قانون ہوگا جس کی روشنی میں ہم کائنات کے متعلق وہ سب کچھ جان لیں گے جس کا جان لینا انسان کے لئے ممکن ہے۔ (صفحہ ۶۴-۶۳)

(SIMPSON) سمپسن اس باب میں لکھتا ہے۔

"نظریۂ ارتقاء سے ہمیں سب سے پہلا اور عظیم الشان سبق یہ ملا کہ حیات ایک ہے یعنی وحدتِ حیات کا سبق ہمیں یہ بتاتا ہے کہ نہ صرف تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں بلکہ تمام اشیائے کائنات میں یہی رشتۂ اخوت کارفرما ہے۔ اس طرح کہ ان سب کا اوّلین سرچشمہ بھی ایک ہے اور یہ سب ایک ہی طریقہ سے مختلف گوشوں میں نشوونما پا کر اپنی موجودہ حالت تک پہنچتی ہیں۔ انسان کائنات ہی کا ایک جزو ہے اس لیے اس کا رشتہ تمام زندگی سے ہے۔" (صفحہ ۱۳۶)

مانچسٹر یونیورسٹی کا اناٹومی پروفیسر (F.W. JONES) اپنی کتاب (DESIGN & PURPOSE) میں اس موضوع پر شرح و بسط سے گفتگو کر کے بتاتا ہے کہ

کائنات میں کس طرح وحدتِ نظم موجود ہے اور یہ تمام نظام کس طرح ایک سوچی سمجھی ہوئی تدبیر (PLAN) کے ماتحت سرگرمِ عمل ہے۔ بحث کے دوران وہ THOMAS DWIGHT کے حوالہ سے لکھتا ہے۔ اگر اس بات کو بفرضِ محال تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس قسم کا حیرت انگیز منظم پلان محض اتفاق (CHANCE) کی پیداوار ہے تو بھی اس قسم کے بے شمار منظم پلانز کا اسی طرح موجود ہونا اس مفروضہ کو مہمل قرار دے دیتا ہے کیونکہ ہم ذی حیات اور غیر ذی حیات

دونوں میں تحیر انگیز نظم دیکھتے ہیں۔ جوں جوں ہم عناصر اور ان کے مرکبات کے متعلق قوانین کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ حقیقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ساری کائنات میں ایک ہی قانون نافذ العمل ہے۔" (ص ۵۹)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان جس فردوس گم گشتہ کے لئے سرگرداں ہے اور حسین خوابوں کی دنیا میں محوِ خواب ہے اور کسی جدید نظام کی تمنا لئے مارا مارا پھر رہا ہے یا بالفاظِ دیگر کسی مثالی معاشرے کا تصور ان مفکرین کے دامنِ نگاہ کو صحنِ گلشن و کفِ گل فروش بنائے ہوتے ہیں۔ اس مثالی معاشرے کے خدوخال کیا ہوں گے۔ یہ لوگ اس دنیا سے تنگ آ کر کس قسم کی نئی دنیا بسانا چاہتے ہیں اور کیا اس قسم کی مثالی دنیا کا قیام ممکن بھی ہے یا نہیں اور اگر ممکن ہے تو کس طرح؟

اس کے لئے نہ تو بڑے بڑے سیمیناروں، کانفرنسوں، اجتماعات، جلسوں، جلوسوں یا مطالبات کی ضرورت ہے بلکہ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ خود تمہارے معاشرے میں موجود گنتی کے افراد کو راہِ راست پر لانے کی ضرورت ہے۔ یہی وہ مستبد قوتیں ہیں جنہوں نے انسانیت کا گلا گھونٹ رکھا ہے۔ انسانیت ان قوتوں کے ہاتھوں سانس بھی نہیں لے سکتی۔ یہ کچھ انبیاء کرامؑ کے ساتھ ہوا۔ انبیاء کرامؑ کی آمد کا مقصدِ حیات یہی رہا ہے کہ انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد کر کے عالمگیر برادری پر قائم ایک ایسے نظام کی بنیاد رکھے جہاں "تیری" اور "میری" کا کوئی تصور نہ ہو۔ قرآنِ کریم نے یہ دلکش تصویر کچھ یوں کھینچی ہے کہ پورے معاشرے کو ٹھیک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ معاشرے میں موجود گنتی کے چند افراد ہی ہوتے ہیں جنہوں نے معاشرے میں بگاڑ پیدا کیا ہوتا ہے اور یہ سلسلہ ملک در ملک پورے کرۂ ارض پر پھیلا ہوا ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام اپنے معاشرہ سے سخت مایوس تھے۔ انسان ہونے کی جہت سے ان کا یہ خیال تھا کہ شاید سارا معاشرہ فساد پیدا کر رہا ہے اور اس فساد میں ہر شخص شامل ہے۔ خدا نے ان کی رہنمائی اس طرح کی کہ اے صالحؑ بات یہ نہیں جو تم سوچ رہے ہو بلکہ بات یہ ہے کہ

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝ (۲۷/۴۸)

مفہوم:۔ اس قوم میں نو بڑے بڑے سردار تھے جن کے ذمے معاشرہ کا نظم و نسق تھا۔ وہی ان تمام شرارتوں کی جڑ تھے۔ وہ ملک میں ناہمواریاں پیدا کرتے تھے اور قوم کو کبھی اصلاح کی طرف نہیں آنے دیتے تھے (حقیقت یہ ہے کہ قوم کا دارومدار ان لوگوں پر ہوتا ہے جن کے ہاتھ میں اقتدار و اختیار اور نظم و نسق ہو وہی عوام کو بگاڑتے ہیں اور انہی کے سنوارنے سے معاشرہ سنورتا ہے)۔

قرآنِ کریم نے کتنی غور طلب بات کی ہے۔ خود اپنے ملک پر نظر ڈالئے۔ پچھلے دو چار سال سے کیا کچھ ہو رہا ہے اور کون کر رہا ہے۔ صالحؑ کے دور میں ان کی تعداد صرف نو تھی۔ ہمارے ملک میں قومی سطح پر ان کی تعداد دو سو سینتیس ہے۔ پھر جب قوم کو چار ٹکڑے کر دیا گیا تو ہر ٹکڑے (صوبے) میں ان کی تعداد، صوبہ سرحد میں اسّی سندھ میں سو، بلوچستان میں چالیس اور پنجاب میں ایک سو ساٹھ ہے۔ اسی طرح مزید صوبوں کو بلدیاتی نظام کے تحت ٹکڑے ٹکڑے کرکے ان کی تعداد مختلف ہے۔ یہ ہیں وہ مستبد قوتیں جنہوں نے انسانیت کا گلہ گھونٹا ہوا ہے۔ یہ نظام صرف ہمارے ملک پر ہی موقوف نہیں۔ اس کی جڑیں پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ایک ایک ملک کو ایک ایک قوم بنا کر اقوام متحدہ بنادی گئی ہے۔ ان مستبد قوتوں نے وحدتِ انسانیت کے راستے میں زبردست رکاوٹیں کھڑی ہوئی ہیں لیکن مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ اس کے خلاف ایسی قوتیں ہر زمانے میں زندہ رہتی ہیں جو انسانوں کو انسانوں کی مالا میں پرونے کے لئے مصروفِ عمل رہتی ہیں۔

عزیزانِ گرامی!

آج جس عنوان کے تحت ہم سب یہاں اکٹھے ہوئے ہیں یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں بلکہ منزل کی طرف پہلا قدم ہے۔ غور کیجئے! منزل کو پانے میں صرف دو ہی تو قدم اٹھانا پڑتے ہیں۔ ایک آج اُٹھ گیا ہے اور دوسرا اٹھنے کو تیار ہے۔ ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ آج کی اس نشست کو کون یاد رکھے گا؟ آیا آج کی یہ نشست تاریخ کا حصہ بھی بن سکے گی یا نہیں؟ تو اس کے لئے اتنا عرض کرتا ہوں کہ کسی بھی شاہکار عمارت کی بنیاد کی اینٹیں کبھی نظر نہیں آتیں لیکن اُن کے وجود سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا۔ جتنی کوئی بنیاد مضبوط ہوگی اتنی عمارت مضبوط ہوگی۔ ہم نہیں ہوں گے لیکن آنے والے مؤرخ کی تاریخ ہمارے وجود سے انکار کے باعث یقیناً نامکمل ہوگی۔ خدا کرے کہ آج کا یہ دن وحدتِ انسانیت کے لئے بنیادی اینٹ کا کام دے۔ آمین۔

آخر میں آپ سب کا بالعموم اور منتظمینِ وحدتِ انسانیت کا بالخصوص شکر گزار ہوں کہ جس صبر و تحمل سے آپ نے مجھے کچھ کہنے کا موقعہ دیا۔ شکریہ۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

حقائق و عبر

قائدِ اعظم کو سیکولرازم کا حامی قرار دینا ملک دشمنی ہے، حکیم احسن

کراچی (پ ر) یومِ قائدِ اعظمؒ کے موقع پر بزمِ طلوعِ اسلام کراچی کے زیرِ اہتمام مقامی ہوٹل میں ایک تقریب منعقد کی گئی جس کی صدارت کراچی کے پہلے میئر اور سابق سفیر حکیم محمد احسن نے کی جبکہ مہمانِ خصوصی قائدِ اعظمؒ کے پرائیویٹ سیکرٹری محمد رضوان تھے۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے حکیم محمد احسن نے کہا کہ قائدِ اعظمؒ کے جس بیان پر آج انہیں سیکولرازم کا حامی قرار دیا جا رہا ہے وہ غلط فہمی اور پاکستان دشمنی کے مترادف ہے۔ انہوں نے کہا کہ قائدِ اعظم اقلیتوں کو ان کے حقوق اسلامی بنیادوں پر دینا چاہتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ پاکستان ایک فلاحی اور اسلامی مملکت بنے۔ رضوان احمد نے تقریب سے خطاب کرتے ہوئے قائدِ اعظمؒ کے نقشِ قدم پر چلنے کی ضرورت پر زور دیا۔ پروفیسر حسنین کاظمی نے پاکستان کے قیام کی کامیاب جدوجہد پر قائدِ اعظمؒ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ قائدِ اعظم جیسا لیڈر صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ تقریب سے صلاح الدین اکبر، افتخار عارف نے بھی خطاب کیا۔

(پرچم۔ ۲۷۔ دسمبر ۱۹۹۳ء)

قائدِ اعظم کبھی بھی سیکولرازم کے حامی نہیں رہے، رضوان احمد۔

کراچی (پ ر) ۲۵ دسمبر قائدِ اعظمؒ کے یومِ پیدائش کے موقع پر بزمِ طلوعِ اسلام کراچی کی جانب سے مقامی ہوٹل میں ایک تقریب منعقد کی گئی جس میں لوگوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ تقریب کی صدارت کراچی کے فرسٹ میئر جناب حکیم محمد احسن صاحب کی۔ مہمانِ خصوصی قائدِ اعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری جناب محمد رضوان صاحب تھے۔ تقریب کا بنیادی مقصد پاکستان کے قیام کے لئے قائدِ اعظمؒ کی اسلام کوششوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنا تھا۔ تقریب کا آغاز جناب ڈاکٹر صلاح الدین اکبر صاحب نے کیا۔ انہوں نے کہا کہ قائدِ اعظم پاکستان کو ایک مثالی اسلامی حکومت بنانے کی خواہش رکھتے تھے۔ خطبہ استقبالیہ جناب افتخار عارف صاحب نے پیش کیا۔ انہوں نے قائدِ اعظمؒ کی پاکستان کے قیام کے لئے جدوجہد پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور ادارہ طلوعِ اسلام اور قائدِ اعظم کے دینی مشیر جناب علامہ پرویزؒ کے مقصد و مسلک

پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان کا یہ ہمیشہ مسلک رہا ہے کہ قرآنی قوانین سے مزین ایک حکومت قائم ہو۔ انہوں نے سیکولرازم کی مذمت کی اور قائدِ اعظمؒ پر سیکولر ہونے کے الزام کی مذمت کی۔ (علامت، ۲۷ دسمبر ۱۹۹۳ء)

تلاش ہے

ایک سب ایڈیٹر کی جو علامہ غلام احمد پرویزؒ کی پیش کردہ قرآنی فکر سے آگاہ ہو، حالاتِ حاضرہ کا قرآن کی روشنی میں تجزیہ کر سکے اور اردو، انگریزی، عربی اور فارسی تحریروں کی ایڈیٹنگ کر سکے۔

مشاہرہ حسبِ اہلیت۔

○

ایک ٹائپسٹ کی جو کمپوٹر "کی بورڈ" پر اردو اور انگریزی ٹائپنگ اور فارمٹنگ میں یکساں مہارت رکھتا ہو۔

مشاہرہ حسبِ اہلیت۔ فوری طور پر رابطہ قائم کریں۔

○

ایک پارٹ ٹائم پروف ریڈر جو عربی، اردو تحریروں کی پروف ریڈنگ کا کم از کم ۳ سال کا تجربہ رکھتا ہو۔

چیئرمین، ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵۔ بی گلبرگ ۲۔ لاہور۔ فون 876219

بچوں کا صفحہ

اسلامی معاشرت
علامہ غلام احمد پرویزؒ

تجارت

پچھلے عنوان میں بتایا جا چکا ہے کہ

اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (۲/۲۷۵)

اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور رِبٰو کو حرام ٹھہرایا ہے۔

تجارت کے معنی کسی چیز کی قیمت لے کر اسے دوسرے کے ہاتھ بیچ دینا، تجارت کہلاتا ہے۔ اس کو بیع و شری (فروخت کرنا اور خریدنا) بھی کہتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کسی چیز کو بیچتے وقت منافع کس قدر لینا چاہیئے؟ اس کے لئے قرآنِ کریم نے یہ اصول بتایا ہے کہ

منافع لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ قف (۴/۲۹)

"ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر مت کھاؤ۔ البتہ کسی چیز کو بیچنے والے اور خریدنے والے کی باہمی رضامندی سے جو بات طے ہو جائے وہ جائز ہے کیونکہ وہ تجارت ہے"

لہٰذا تجارت میں منافع گاہک کی رضامندی سے طے پانا چاہیئے۔ اس کی صحیح شکل یہ ہے کہ ہر شے کی قیمتِ خرید (یا لاگت) اس

پر درج ہو اور منافع کی شرح (یعنی جس حساب سے منافع لینا چاہیئے) حکومت کی طرف سے مقرر ہو۔ اور اگر حکومت کی طرف سے مقرر نہ ہو تو پھر گاہک اور دوکاندار کی باہمی رضامندی سے منافع طے پا جاتے۔ نہ دوکاندار گاہک کو لوٹنے کی فکر میں رہے اور نہ ہی گاہک، دوکاندار کو جائز منافع سے محروم کرنے کی کوشش کرے۔ یہ ہے تِجَارَةً تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ (باہمی رضامندی سے تجارت کی شکل)۔

منافع مقرر کرنے کا معیار یہ ہونا چاہیئے کہ اس شخص نے ..... اس کاروبار میں جس قدر محنت کی ہے اسے اس کا معاوضہ مل جائے۔ اس لئے کہ قرآن شریف کی رُو سے محنت سے زیادہ معاوضہ لینا درست نہیں۔

لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳/۳۹)

"انسان صرف اس کا حقدار ہے جس کے لئے وہ کوشش (محنت) کرے"

ماپ تول

یہ تو ہوئی قیمت کی بات۔ باقی رہا ماپ تول کا معاملہ، سو اس کے متعلق حکم ہے کہ

اَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ (۱۷/۳۵)

"جب کوئی چیز ماپ کر دو تو ماپ پورا رکھو اور جب تول کر دو تو تول پورا کرو"

پورا تول

پورا ناپو، جس کا جو حق ہے اسے بلا حیل و حجت دو۔

DARS-E-QURAN

(Recorded Lectures of Allama Ghulam Ahmed Parwez (r).

(BOOKS OF ALLAMA GHULAM AHMED PARWEZ AND MAGAZINE TOLU-E-ISLAM ARE ALSO AVAILABLE AT THESE PLACES)

1. **BIRMINGHAM**
   229 Allum Rock Road
   Birmingham
   On every Sun at 15.00 hrs.

2. **CANADA**
   716 The west Mall, Etobicock, ONT
   Phone (416)245-5322
   On 1st Sun at 11.00 hrs.

3. **DENMARK**
   Julius Valentiners 25, 2.th.
   2000 Frederiksberg V
   Ph. 38346534
   On last Sat at 19.00 hrs.

4. **ESSEX**
   50 Arlington Road, Southend-on-Sea,Essex SS2 4UW
   Phone: 0702-618819
   On 2nd Sun at 15.00 hrs.

5. **KUWAIT**
   Residence Ubaid-Ur-Rahman Arain
   Ph.5316273
   On every Fri at 18.15 hrs.

6. **LONDON**
   76 Park Road, Illford Essex
   Phone: 081-553-1896
   On 1st Sun at 14.30 hrs.

7. **NORWAY**
   Akeberg Veien-56, Olsó 6
   Galgeberg, 4th floor.
   On 1st Sun at 16.00 hrs.

8. **YARDLEY**
   633 Church Road, Yardley,
   Birmingham B33 8HA
   Phone 021-628-3718
   On last Sun at 14.00 hrs.

9. **YORKSHIRE**
   Cardigan Community Centre
   145-49 Cardigan Road Leeds-6
   Phone 0532-306140
   On 1st Sun at 15.00 hrs.